اقبال اکادمی

اقبال اور سیاستِ ملّی

رئیس احمد جعفری (ندوی)

اقبالؒ
اور
سیاستِ ملّی

- مکاتیب
- خطبات، تقاریر، بیانات
- شاعری

از

رئیس احمد جعفری (ندوی)

ناشرین

اقبال اکیڈیمی، کراچی

طبعِ اوّل .. .. ایک ہزار
مطبوعہ .. .. فیروز سنز لمیٹڈ کراچی
قیمت .. .. پانچ روپے پچاس پیسے

اقبالؒ اور سیاستِ ملّی

لالهٔ این چمن آلودهٔ رنگ است هنوز
سپر از دست مینداز که جنگ است هنوز
فتنهٔ را که دو صد فتنه بآغوش بود
دخترے هست که در مهدِ فرنگ است هنوز
اے که آسوده نشینی لبِ ساحل برخیز
که ترا کار بگرداب و نهنگ است هنوز!
از سرِ تیشه گذشتن ز خردمندی نیست
اے بسا لعل که اندر دلِ سنگ است هنوز

اِنتساب

اِقبالؒ کے کہن سال اور وفادار خادم

علی بخش

کے نام!

فہرست مضامین اقبال اور سیاست ملی

افتتاحیہ

سیاست ملی میں اقبال کا مقام

پہلا حصہ

مکاتیب

۱۔ اپنا بیان اپنی زبان۔ ۵۷

اپنا بیان اپنی زبان۔ ۶۱

انقلابی مقصد۔ ۶۳

ایک غلط فہمی کی تردید۔ ۶۴

خاص مقاصد۔ ۶۶

چند اعتراضات اور اُن کا جواب۔ ۶۷

حدودِ خودی کا تعین۔ ۶۷

جہاد اور جنگ۔ ۶۹

شاہین۔ ۷۰

اقبال کے مغربی تنقید نگار اور اقبال۔ ۷۱

نٹشے اور اقبال ۷۲

انسان کامل کی تلاش ۷۴

فلسفۂ سخت کوشی۔ ۷۷
اقبال کا فلسفہ عالمگیر ہے یا محدود ہے؟ ۷۹
ایک اہم نکتہ۔ ۸۲
جدید اور قدیم۔ ۸۴
۲۔ مذہبیت۔ ۸۷
مذہبیت۔ ۸۹
نذرانہ یا رشوت؟ ۹۰
قرآن کا مسلک۔ ۹۱
اسلام ناآشنا مسلمان۔ ۹۱
نظامِ اسلام' ۹۲
میرا دل مومن ہے' ۹۳
علی گڑھ سے امیدیں۔ ۹۵
اسلام اور سوشلزم۔ ۹۶
لندن یا مصر؟ ۹۷
ترک اور اسلام۔ ۹۸
عشقِ رسول۔ ۹۹
مسلمانوں کی نوجوان نسل اور مذہب۔ ۹۹
پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ اور جشن صلح۔ ۱۰۰

۳۔ ملّت اسلامیہ اور اُس کا مشن۔ ۱۰۷

جوہر مسلمانی۔ ۱۰۷

قلندر۔ ۱۰۸

نازک زمانہ۔ ۱۰۹

بھُولا ہوا سبق۔ ۱۱۰

۴۔ سیاست وطنی! ۱۱۳

سیاست وطنی۔ ۱۱۷

وفد خلافت۔ ۱۱۸

ہندو مسلم اتحاد۔ ۱۱۹

اسلام کا نظامِ مملکت۔ ۱۲۱

کانگریس کا اعلانِ آزادی ۱۲۲

اسلام کیا ہے اور وطنیت کیا چیز ہے؟ ۱۲۳

محمد علی کی یاد۔ ۱۲۴

فلسطین، یہود اور انگریز۔ ۱۲۵

جمہوریت کا آغاز خون ریزی سے۔ ۱۲۷

ایک پیشین گوئی ۱۲۸

قائد اعظم رحمؒ کے نام۔ ۱۲۹

کچھ جواہر لال کے بارے میں۔ ۱۳۰

مسلمانوں کی ملّی انفرادیت۔ ۱۳۳

مسلمانوں کے افلاس کا حل اور "اسلامی دستور" ١٣٦
ملک کی تقسیم یعنی پاکستان کا مطالبہ۔ ١٣٧
خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے۔ ١٣٨
ہندو اور مسلم صوبے۔ ١٤٠
مسلم صوبوں کا جداگانہ وفاق۔ ١٤١
کیمونل ایوارڈ اور غدار مسلمان۔ ١٤٢
جیل جانے پر آمادگی۔ ١٤٥
عطیہ بیگم کے نام ایک خط۔ ١٤٦
۵۔ کشمیر! ١٤٩
کشمیر۔ ١٥٣
تذکرہ شعرائے کشمیر۔ ١٥٤
شیخ عبداللہ کے نام۔ ١٥٥
کشمیر کے بے بس مسلمان۔ ١٥٦
کشمیری مسلمان کے مقدمات۔ ١٥٧
بہار کا المناک زلزلہ اور کشمیر۔ ١٥٨
سر ظفر اللہ خان کا تذکرہ ١٥٩
۶۔ قادیانیت! ١٦١
قادیانیت۔ ١٦٥
ختم نبوت۔ ١٦٦

قادیانی فتنہ۔ ۱۶۶
قادیانی مذہب۔ ۱۶۷
پیغمبر کا کام۔ ۱۶۸
مسئلہ بروز۔ ۱۶۹
مسیحیت۔ مہدویت۔ مجددیت۔ ۱۷۰
لاہوری جماعت۔ ۱۷۱

حصّہ دوم

خطبات۔ تقاریر۔ بیانات

۱۔ پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی! ۱۷۵
انکم ٹیکس اور لگان۔ ۱۸۰
غیر ملکی حکومت اور تعلیم۔ ۱۸۲
"قومیت" ایک پُرفریب تصوّر۔ ۱۸۳
ہندو مسلم فسادات۔ خانہ جنگی کا دور۔ ۱۸۷
انگریزی اور دیسی طریقہ علاج۔ ۱۸۹
زمین کا مالک کسان ہے یا حکومت؟ ۱۹۰
بجٹ پر ایک تقریر۔ ۱۹۴
۲۔ مسلم لیگ! ۲۰۱
مسلم لیگ سے استعفےٰ۔ ۲۰۶
مسلم لیگ کی صدارت۔ ۲۰۹

خطبۂ صدارت۔	۲۱۰
مسلمان اور اُس کا مذہب	۲۱۱
اسلام ایک زندہ قوت ہے۔	۲۱۲
کیا مذہب ایک نجی اور ذاتی سوال ہے؟	۲۱۳
مسلمان کیا چاہتے ہیں؟	۲۱۵
پاکستان کا تصوّر۔	۲۱۷
اسلام کلیسائی نظام نہیں۔	۲۲۰
صوبوں کی نئی تقسیم۔	۲۲۱
ہندوستان کا برّی اور بحری تحفظ	۲۲۳
گلۂ جفائے وفا نما۔	۲۲۴
نیا جال لائے پُرانے شکاری	۲۲۶
گول میز کانفرنس۔	۲۲۹
اقبال پر جواہر لال کی تنقید۔	۲۳۴
تقسیم ہند کے تخیّل پر برہمی۔	۲۳۵
۳۔ مسلم کانفرنس۔!	۲۳۷
سیاست ہند کا نیا دور	۲۴۱
انگلستان اور ہندوستان	۲۴۴
ہندو مسلم مسئلہ۔	۲۴۵
مسلمان کمیونزم کے آغوش میں۔	۲۴۶

ہندوؤں کے خلاف تعصب نہیں ۔ ۲۴۷
اسلام ایک سوسائٹی ہے۔ ۲۴۹
فرقہ وارانہ مصالحت ۔ ۲۵۱
اہم مطالبات ۔ ۲۵۶
ایک سوال اور اس کا جواب ۔ ۲۵۷
حکومتِ برطانیہ کو انتباہ ۔ ۲۵۹
اپنے وجود کو مٹا دو۔ ۲۶۰
اکثریت اور اقلیت کی جنگ ۔ ۲۶۱
سخت بنو اور سختی جھیلو ۔ ۲۶۲
صرف ایک سیاسی جماعت ۔ ۲۶۳
ہندوستان کی بالادستی تسلیم ہے ۔ ۲۶۵
فرقہ وارانہ فیصلہ ۔ ۲۶۸
سمجھوتہ کا دروازہ کھلا ہے ۔ ۲۷۰
سر سید کا ذکر ۔ ۲۷۰
اقبال پر اعتراض اور اس کا جواب ۲۷۱
شکوۂ بیجا ۔ ۲۷۱
ایوارڈ کی بنیاد ۔ ۲۷۲
اب کیا کیا جائے ؟ ۲۷۳
سیاست کا نیا دور ۔ ۲۷۴

انتخابات کی تیاری۔ ۲۷۵

تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ۔ ۲۷۵

مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی۔ ۲۷۶

جواہرلال سے ٹکر۔ ۲۷۸

اقبال جواہرلال کی نظر میں۔ ۲۷۹

جواہرلال اقبال کی نظر میں۔ ۲۸۰

گاندھی جی کا ذکرِ خیر۔ ۲۸۱

آغاخان کی پیشکش۔ ۲۸۴

قومیت کا اصول کیا ہے؟ ۲۸۵

مسلمان اور جمہوریت۔ ۲۸۶

ایک بے بنیاد الزام۔ ۲۸۷

ایک ٹیڑھا سوال۔ ۲۸۸

کانگریس پر اعتراض۔ ۲۸۸

۱۴۔ کشمیر! ۲۹۱

پس منظر۔ ۲۹۳

کشمیر میں آزادی کی لہر۔ ۲۹۵

اقبال کا تبصرہ۔ ۲۹۶

بے نتیجہ تحقیقاتی کمیشن۔ ۲۹۷

کشمیر میں ظلم و تشدد۔۔۔ ۲۹۸

اقبال کا بروقت انتباہ۔ ۲۹۸

صائب مشورہ۔ ۳۰۰

کشمیر کمیٹی۔ ۳۰۰

اقبال کا ایک اہم بیان ۳۰۱

قادیانی حضرات کا طرزِ عمل۔ ۳۰۲

کشمیر کمیٹی توڑ دو۔ ۳۰۳

نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کا مشورہ۔ ۳۰۳

گلانسی کمیشن کے سفارشات۔ ۳۰۴

مدبرانہ مشورہ۔ ۳۰۵

لیکن ۔۔۔۔۔۔۔! ۳۰۵

۵۔ قادیانیت! ۳۰۷

ایک خالص دینی اور علمی مسئلہ ۳۱۱

سب سے پہلا بیان ۳۱۲

اسلامی وحدت کی بنیاد ختم نبوت ہے۔ ۳۱۲

نبوت کے تسلسل کا نظریہ۔ موبدانہ تمدن کا نتیجہ ہے۔ ۳۱۳

بہائیت اور قادیانیت۔ ۳۱۴

مسئلہ کا بہترین حل۔ ۳۱۵

الہام پر بحث۔ ۳۱۶

اقبال اور حدیث۔ ۳۱۷

ایک استفسار اور اُس کا جواب۔ ۳۱۸
اسٹیٹسمین کا اعتراض اور جواب۔ ۳۲۰
مسلم اور غیر مسلم کے درمیان حدفاصل۔ ۳۲۱
دنیائے اسلام کا فرض ہے۔ ۳۲۲
جداگانہ سیاسی حقیقت سے گریز کیوں؟ ۳۲۳
پنڈت نہرو کی طرف سے اقبال کی مخالفت۔ ۳۲۴
پنڈت نہرو کی ذہنیت۔ ۳۲۵
امر تنقیح طلب۔ ۳۲۷
ایک بے بنیاد اعتراض۔ ۳۲۸
قادیانیت کے دو گروہ۔ ۳۲۹
ختم نبوت کی تہذیبی قدروقیمت۔ ۳۳۰
احمدیت کی رُوح اور ماخذ۔ ۳۳۲
پنڈت نہرو کا مشورہ۔ ۳۳۳
انحطاط الہام کا ماخذ بن جاتا ہے۔ ۳۳۴
رُوس اور انگلستان کا اتحاد مسلمانوں کے خلاف۔ ۳۳۶
اسماعیلی اور قادیانی۔ ۳۳۷
۶۔ اسلام اور عالمِ اسلام! ۳۳۹
انسانیت کا روگ اور اُس کا علاج۔ ۳۴۱
القدس یونیورسٹی۔ ۳۴۳

کابل یونیورسٹی۔ ۳۴۴

یورپ اور اسلام۔ ۳۴۶

سفرِ افغانستان کے تاثرات۔ ۳۴۸

چینی ترکستان کی شورش۔ ۳۴۹

تقسیم فلسطین کی تحریک۔ ۳۵۳

اقبال کا غم و غصّہ ۳۵۵

تاریخی پس منظر۔ ۳۵۶

برطانیہ کے سامراجی ارادے۔ ۳۵۶

ترکوں اور عربوں کے اتحاد کی تجدید۔ ۳۵۷

قوم نہ کہ فرد! ۳۵۸

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق۔ ۳۶۰

حصّہ سوم
(شاعری)

پہلا دور۔ وطن پرستی اور قوم پروری۔ ۳۶۹

۱۔ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے! ۳۷۱

اے ہمالہ ۳۷۷

صد لئے درد ۳۷۸

امتیاز دیر و حرم۔ ۳۷۹

وطن کی نوحہ خوانی۔ ۳۸۰

زخمِ پنہاں۔ ۳۸۱
تعصّب۔ ۳۸۲
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا۔ ۳۸۳
ترانۂ ہندی۔ ۳۸۴
وطن کا سپاہی۔ ۳۸۵
قومی گیت۔ ۳۸۶
نیا شوالہ۔ ۳۸۷
وطن ۳۸۹
مذہب باہم۔ ۳۸۹

دُوسرا دَور!

۱۔ طبیّت اور بین الاسلامیّت! ۳۹۱
واحد چارۂ کار۔ ۳۹۵
تلملاہٹ اور برہمی۔ ۳۹۸
تہذیبِ حجازی کا مزار۔ ۴۰۱
حصارِ ملّت۔ ۴۰۳
خدا کی بستی دُکاں نہیں ہے۔ ۴۰۴
ترکیبِ مزاج روزگار۔ ۴۰۵
ملّت کے نوجوان سے۔ ۴۰۶
شمع و شاعر۔ ۴۰۷

جذبِ باہم جو نہیں محفلِ انجم بھی نہیں۔ ۴۰۸
بادۂ تہذیبِ حاضر۔ ۴۰۹
خضرِ راہ۔ ۴۱۰
طلوعِ اسلام۔ ۴۱۱
مسلمِ ہندی شکم را بندہ۔ ۴۱۲
نشاطِ باغ۔ ۴۱۳
غلامی۔ ۴۱۵
مجلسِ امم۔ ۴۱۵
۲۔ نقشِ فرنگ: ۴۱۷
تفریقِ ملل یا ملتِ آدم۔؟ ۴۲۱
اخوت کا انحصار — دین پہ یا ملت پر۔؟ ۴۲۲
عصرِ حاضر۔ ۴۲۴
لادینی افکار۔ ۴۲۴
دین و تعلیم۔ ۴۲۴
فرنگی معاشرت۔ ۴۲۵
ایک سوال۔ ۴۲۵
عورت اور تعلیم۔ ۴۲۶
خودی کا قتل۔ ۴۲۶
سیاستِ فرنگ۔ ۴۲۷

ابلیس کا فرمان۔ ۴۲۶
جمعیتِ اقوام کا جواب۔ ۴۲۸
مشرق و مغرب ۴۲۹
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک۔ ۴۳۱
ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ۔ ۴۳۲
ما متاع و ایں ہمہ سوداگران۔ ۴۳۳
تقلیدِ فرنگ۔ ۴۳۴
خرابات فرنگ۔ ۴۳۵
۳۔ غلامی! ۴۳۷
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات۔ ۴۴۳
افسوس کہ باقی نہ مکان ہے نہ مکین ہے۔ ۴۴۵
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من۔ ۴۴۶
مردِ جعفر زندہ رُوح او ہنوز۔ ۴۴۷
الامان از جعفرانِ این زماں۔ ۴۵۱
ننگِ آدم ننگِ دین ننگِ وطن۔ ۴۵۲
ہر زمان میر و غلام از بیم برگ ۴۵۲
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک۔ ۴۵۴
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں۔ ۴۵۵
فرد و ملّت ۴۵۶

اے وائے تن آسانی۔	۴۵۹
یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ۔	۴۶۱
یا راہبی کر یا بادشاہی۔	۴۶۳
مقامِ شبّیری۔	۴۶۴
۴۔ ہندی اور بین الاقوامی سیاست!	۴۶۷
ہندی اور بین الاقوامی سیاست۔	۴۷۱
انگریز سمجھتا ہے مسلمان کو گداگر۔	۴۷۲
ایک نکتہ۔	۴۷۴
اشتراکیت۔	۴۷۴
بین دین۔	۴۷۵
لادین سیاست۔	۴۷۵
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند۔	۴۷۶
ایران انقلاب کے بعد۔	۴۷۶
افغانستان۔	۴۷۸
پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق۔؟	۴۸۱
۵۔ کشمیر!	۴۸۳
کشمیر۔	۴۸۵
نشاط باغ میں بیٹھ کر۔	۴۸۷
کشمیر کی یاد۔	۴۸۹

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟ — ۴۹۰

۷- قادیانیت: — ۴۹۱

قادیانیت۔ — ۴۹۵

مہدی برحق۔ — ۴۹۶

امامت۔ — ۴۹۷

الہام اور آزادی۔ — ۴۹۷

نبوت۔ — ۴۹۸

نفسیاتِ غلامی۔ — ۴۹۹

جہاد۔ — ۴۹۹

اقبالؒ

اور

سیاستِ ملّی

پہلا حصّہ

مکاتیب

بہت سے نجی اور پرائیویٹ خطوط اقبال نے اپنے دوستوں، مداحوں، قدر شناسوں، عزیزوں اور وقت کے سربرآوردہ اصحاب کے نام لکھے۔ انہیں اب تک صرف خطوط کی حیثیت سے پڑھا گیا ہے لیکن مَیں نے ان کے بین السطور میں اقبال کا دِل دھڑکتا دیکھا ہے۔ ان خطوں میں اقبال محوِ تکلم نظر آتے ہیں لیکن محوِ جستجو بھی۔ ان خطوں میں کہیں کہیں ایسی باتیں بھی اقبال کی زبانِ قلم پر آجاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے اقبال کا اندازِ فکر کیا ہے؟ کیسے کیسے سوالات ان کے دِل میں آتے ہیں؟ وہ کس طرح سوچتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں؟ —— میں نے اِس طرح کی باتیں صدہا خطوں میں سے چُن لی ہیں جن سے اقبال کو سمجھنے اور پرکھنے میں بہت مدد ملے گی!

اِفتتاحیہ

بر جہانِ دلِ ما تاختنش را نگرید
کُشتن و سوختن و ساختنش را نگرید

سیاستِ ملّی میں اقبال کا مقام

اقبال ایک شاعر تھے اور ان میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک شاعر میں ہونی چاہئیں۔ بے پروا۔ آشفتہ خاطر۔ پریشان مو پریشان حال۔ جلوت سے نفور خلوت کے نشہ سے مخمور۔ عمل سے کنارا کش۔ دنیائے تخیل کے شہر یار ہنگاموں سے دُور۔ گوشۂ عزلت کے شیدائی شورش سے بیزار۔ سکون کے پرستار۔ علم کے جویا۔ دریائے تحقیق کے شناور۔ مطالعہ فن کے سودائی جذبات سے بھرپور جہد زندگی اور کارزار حیات سے بے تعلق۔ دین و ملت کے لیے سینہ سپر۔ اپنے آپ سے بے خبر۔ سب سے بے نیاز۔ سب سے الگ سب سے جدا۔ ہجوم میں تنہا۔ تنہا لیکن خود ایک انجمن

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانا ابھی وہی کیفیت ہے اُس کی
کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

شاعر ایسے ہی ہوتے ہیں اقبال بھی ایک شاعر تھے وہ کیوں اس سے مختلف ہوتے جو قبائے شاعری جس کی قامت پر راس آگئی پھر وہ اپنے آپ میں نہیں رہتا بے خود ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا کچھ ہے کرتا کچھ ہے، رہتا کہیں ہے، بتا کہیں ہے، کرتا کچھ ہے کہتا کچھ ہے۔ زندگی کی صبح اسی طرح شام بن جاتی ہے۔ اور بالآخر شام زندگی پر ،

زندگی کا نہ ختم ہونے والا اندھیرا چھا جاتا ہے۔ یہ ہے انجام حیات۔

لیکن ہر کلیہ کا ایک استثنا ہوتا ہے۔ شاعروں کے اس گروہ میں کچھ من چلے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی گفتار و کردار کے اعتبار سے عہد آفرین ہوتے ہیں۔ انقلاب ان کے جلو میں چلتا ہے۔ ان کا وجود ایک زلزلہ ہوتا ہے۔ اور اس زلزلہ سے یہ جہاں رنگ و بو زیر و زبر ہوتا رہتا ہے۔ یہ جس دنیا میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسے تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ اور ایک نئی دنیا تعمیر کر لیتے ہیں۔

گفتند جہان ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد. گفتند کہ برہم زن

فکر و تخیل کے جس ماحول میں یہ آنکھ کھولتے ہیں وہ ماحول اپنے اندر انھیں اپنانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ یہ اس سے بغاوت کرتے ہیں۔ اور نئے مکتب فکر کی بنیاد ڈال لیتے ہیں۔

با من میا میز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

ان کی واہ بھی انفرادیت رکھتی ہے اور آہ بھی۔ ان کا نالہ بھی جدا ہوتا ہے۔ اور ان کی زبان بھی سب سے الگ۔ دنیا جہاں سر جھکاتی ہے۔ یہ وہاں باغی بن کر پہنچتے ہیں۔ جس سنگ در پر خلقت جبہ سا ہوتی ہے یہ اسے ٹھکراتے ہیں۔ اور اس سے ٹکراتے ہیں۔ ان کا آستانہ عام آستانوں سے الگ ہوتا ہے۔ یہ صاحب کتاب نہیں ہوتے لیکن کار پیمبری کر گزرتے ہیں۔

پیغمبری کرد و پیمبر نتوان گفت

یہ عامل بن جاتے ہیں اور مخلوق معمول۔ ان کا ایک شعر گرم بڑی بڑی لچھے دار تقریروں اور فصیح و بلیغ تحریروں پر بھاری ہوتا ہے۔ ان میں وہ طاقت ہے جس سے بڑے بڑے سپہ سالار، فاتح اور کشور کشا محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دبدبہ اور طنطنہ کے آگے شاہ و شہریار ہیچ ہوتے ہیں۔ ان کی آن اور شان وقت کے فرمانرواؤں اور سلطانوں کا شکوہ خسروی اور فر جمشیدی ختم کر دیتا ہے۔ یہ طوفانوں سے کھیلتے ہیں۔ پہاڑوں سے ٹکراتے ہیں۔ سمندروں کو پامال کرتے ہیں یہ جس راہ پر چلتے ہیں شروع میں اس کی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ ایک پگڈنڈی سے بھی کم۔ لیکن بہت جلد وہ ایک شاہراہ بن جاتا ہے۔ جس پر سے قافلے گزرتے ہیں۔ کارواں چلتے ہیں۔ قومیں اور ملتیں جادہ حیات سمجھ کر اس پر رہبری کرنے لگتی ہیں۔ یہ بیک وقت جادہ صواب بھی ہوتے ہیں، شمع راہ بھی۔ اور خضر طریقت بھی۔ آتش نوا خطیب انھیں کی پیدا کی ہوئی چنگاریوں سے آتش نوائی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ شعلہ مقال واعظ انھیں کی شعلہ سامانیوں سے اپنی محفل گرم کرتے ہیں۔ ان کے اشعار بزم و انجمن میں نئی روح پیدا کرتے ہیں۔ خانقاہوں اور زاویوں میں وجد و حال کا سبب بنتے ہیں۔ میکدوں اور رندوں کی محفل میں سیاست دانوں اور عالموں کے داشے میں مزدوروں کی جھونپڑی میں۔ دولت مندوں کے کاشانے میں۔ حکومت کے ایوان میں دوستوں کی بزم بے تکلف میں۔ دشمنوں اور نکتہ چینوں کے مجمع میں۔ ان کے اشعار لکھے جاتے ہیں۔ پڑھے جاتے ہیں۔ سنے جاتے ہیں۔ کوئی سر دھنتا ہے کسی کا ہاتھ تا بہ گریباں پہنچتا ہے۔ کہیں کیف و نشاط کا عالم طاری ہوتا ہے۔ کوئی مست الست بن جاتا ہے۔

اقبال کا شمار اس آخری گروہ میں تھا۔ وہ نواب مرزا خان داغ کے شاگرد تھے۔

وہی داغ جو اپنی معاملہ بندی۔ ہوسناکی۔ رندی اور سرمستی۔ زبان کی صفائی۔ بیان کی خوبی اور انداز کی سحر طرازی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ جن کے منہ سے الفاظ موتی کی طرح جھڑتے ہیں۔ جن کا سہل ممتنع اپنی مثال آپ ہے۔ جن کے بارے میں سب جانتے ہیں۔

"تخلص داغ ہے اور عاشقوں کے دل میں رہتے ہیں"۔

لیکن کیسی عجیب بات ہے استاد کا یہ شاگرد کبھی مشاعرہ کی زینت بنا نہ محفل ناز و نوش میں اس نے الفاظ کا طلسم باندھ کر لوگوں سے اپنی سحر بیانی کی داد لی نہ استاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی پھڑکتا ہوا شعر سنا کر بے ساختہ نعرہ لگایا

ہائے لا استاد کیوں کیسی کہی؟

نہ الفاظ کی نقش بندی اور نگینہ سازی کو اپنی متاع سخن کا معیار قرار دیا۔

اقبال نے جب دنیائے شاعری میں قدم رکھا تو وہ تنہا نہ تھے۔ دلی اور لکھنؤ۔ لاہور اور حیدرآباد شعر و شاعری کے مرکز تھے۔ یہ شہر ان شاعروں کے مسکن تھے جو عاشق نہیں ہوتے لیکن عشق کرتے ہیں۔ جو لذت درد سے ناواقف ہوتے ہیں لیکن تڑپتے رہتے ہیں۔ جو گداز قلب کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہوتے لیکن درد دل میں مبتلا رہتے ہیں۔ جو آہ کرتے ہیں لیکن آہ نہیں کرنا جانتے۔ جو روتے ہیں لیکن جن کے رونے پر ہنسی آتی ہے۔ یہ الفاظ سے کھیلتے ہیں۔ ردیف اور قافیہ بحر اور وزن لفظ اور محاورہ۔ ترکیب اور بندش لغت اور سند۔ یہ ایک جال تھا جسے انہوں نے خود بنا تھا۔ اور اسی میں الجھ کر رہ گئے تھے۔

کچھ عرصہ تک تو اقبال اس راستہ پر چلے لیکن بہت جلد انھوں نے محسوس کر لیا۔

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب بانگ جرس اے دل تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

ان کے دل میں جو خیالات پرورش پا رہے تھے وہ کچھ اور تھے۔ انھیں نگاہِ ناز۔ خنجرِ ابرو۔ برقِ تبسم۔ زلفِ رسا۔ عارضِ گل گوں اور ان سب کے مجموعے یعنی کسی شاہد ہرجائی سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی اپنے ملک سے۔ اپنی قوم سے۔ اپنی ملت سے۔ اپنے دین سے اپنے مذہب سے۔ اپنی تہذیب اور تمدن اور ثقافت سے اپنے حال سے۔ اور اپنے ماضی سے وہ بھی رات بھر جاگتے تھے، اختر شماری بھی کرتے تھے۔ لیکن اس لیے نہیں کہ۔

میرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں!

خدا وہ دن کرے اس سے جو میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ان کی شب بیداری اور اختر شماری اپنی قوم کے لیے تھی۔ ان کا علم وسیع تھا ان کا مطالعہ وسیع تھا ان کی نظر وسیع تھی وہ پڑھتے تھے اور سوچتے تھے۔ جب وہ فکر میں مستغرق ہوتے تو تاریخ کے اوراق ان کے سامنے کھل جاتے۔ ملت اسلامیہ کا شاندار اور پر وقار ماضی ان کا ذہن دل اپنی طرف کھینچ لیتا۔ وہی ملت جس نے عرب کے ریگ زار سے نکل کر کسریٰ کا تاج چھین لیا تھا۔ اور ہرقل کا تخت زیر و زبر کر دیا تھا۔ جس نے ایران کی عظمت اپنے پاؤں تلے روند ڈالی تھی۔ اور روم کی کج کلاہی جس کے سامنے سرنگوں ہو گئی تھی۔ جو علم کی مشعل لے کر اپنے تنگنائے سے نکلی تھی اور اس روشنی سے اس نے یورپ کا تیرہ خاک دان روشن اور منور کر دیا تھا۔ جو میدانِ نمود میں ابھری اور جس نے آن کی آن میں دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ وہ کون ملک تھا جو اس کا زیر نگین نہ ہو گیا ہو؟۔ وہ کون مقام تھا جہاں اس کے نقشِ قدم خضرِ طریقت بن کر دوسروں کی رہنمائی کے موجب نہ ہوئے ہوں؟۔ وہ

کون علم تھا جس میں اس نے گراں قدر اضافے نہ کئے ہوں ؟ ۔ وہ کون فن تھا جو اس کی کارگاہ فکر میں ڈھل کر آب و رنگ کا پیکر نہ بن گیا ہو ؟ ۔ اس قوم کے افراد صحرا سے نکلے اور انھوں نے ساری دنیا کو اپنا ممنون کرم بنا لیا ۔ انھوں نے بڑے بڑے شہر بسائے تعلیم گاہیں کھولیں ۔ کاروان سرائے بنائیں ۔ کنوئیں کھودے ۔ سڑکیں تعمیر کیں ۔ رسل و سائل اور مواصلات کا نظام مرتب کیا ۔ باغ لگائے ۔ چمن بندی کی ۔ فلک فرسا عمارتیں تعمیر کیں ۔ دریاؤں پر پل باندھے ۔ اپنی صنعت و حرفت ۔ زراعت و فلاحت اور ایجاد و اختراع کا چار دانگ عالم میں ڈنکا بجایا ۔ ایک نئی تہذیب پیدا کی ۔ ایک نیا تمدّن ایجاد کیا ۔ ایک نئے معاشرہ کی بنا ڈالی ۔ جو پامال تھے انھیں سربلند کیا ۔ جو مظلوم تھے ان کی دادرسی کی ۔ جو غلام تھے ان کے سر پر تاج شاہی رکھا ۔ جو بے مایہ اور بے نوا تھے ۔ انھیں اقتدار و اختیار عطا کیا ۔ جو مفلس اور قلاش تھے انھیں دولت مند اور امیر کبیر بنا دیا ۔ جو کچھ نہ تھے وہ اس قوم کے طفیل سب کچھ بن گئے ۔

وہ قوم جس نے ایسے عظیم تحلیقی اور تعمیری کارنامے انجام دیئے ۔ آج کیا ہے ۔۔۔ جاہل ۔ بے مایہ ۔ کمزور ۔ اور حد یہ کہ غلام !

یہ دیکھ کر اقبال تڑپ اٹھا بے تاب ہو گیا ۔ اس نے سوچا یہ جنگلوں میں پھرنے والے یہ مجنوں کا سوانگ رچانے والے اور یہ رندی و ہوسناکی کا پرچار کرنے والے شاعر بہت ہیں ۔ میں اپنے رستے چلتے رہیں میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ میں ان کا ساتھ نبھا بھی نہیں سکتا ۔ کہاں یہ کہاں میں ۔ ؟

گلشن کی زبان اور ہے صحرا کی زبان اور
فریاد جنوں اور ہے بلبل کی فغاں اور

یہی محسوس کر کے اقبال نے اپنا رنگ سخن بدلا۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کس طرف جائیے؟ وہ بھٹکتا رہا۔ اور اپنے دل کو تسلّی دیتا رہا۔

مل ہی جائے گی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبال
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر!

لیکن یہ تسلّی بے کار ثابت ہوئی بادیہ پیمائی میں دن گزرتے چلے گئے لیکن نہ راہِ صواب ملی۔ نہ منزلِ مقصود تک رسائی ہو سکی۔ جس راستہ پہ رہروی مقصود نہیں تھی۔ وہ اپنی ساری رعنائیوں اور فتنہ سامانیوں کے ساتھ جنّت نگاہ بنا ہوا۔ نظر کے سامنے موجود تھا۔ لیکن جس منزل کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی تھی اس کا راستہ نظروں سے اوجھل تھا۔ اب قدم بڑھیں تو کس طرف؟ رہروی کی جائے تو کہاں؟ یہ ایک خلش تھی جس نے عرصہ تک اقبال کو مہر بہ لب رکھا اگر کہا تو صرف اتنا۔

مدیرِ مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے!
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے

بات یہ ہے کہ چلے ہوئے راستہ پر چلنا بہت آسان ہوتا ہے۔ راستہ ہموار۔ نشانِ قدم موجود۔ منزل متعین۔ لیکن اگر صورت بر عکس ہو یعنی راستہ ناہموار اور دشوار گذر ہی نہیں ناپید بھی ہو۔ ایسی صورت میں آدمی کیا کرے؟ کس طرح اپنا راستہ آپ بنائے؟ کیوں کر خود اپنی رہبری کرے؟

اقبال نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو اسی مشکل سے انہیں دوچار ہونا پڑا۔ چمنستانِ شاعری میں گل و بلبل کے افسانے گائے جا رہے تھے۔ کاکل پر خم

اور زلفِ پیچاں کا رونا رویا جارہا تھا ساعدِ سیمین اور ساقِ زرین کی حکایتیں بیان ہو رہی تھیں۔ ہجر و فراق کی نہ ختم ہونے والی داستانوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وصل و آرزوئے وصل میں ہر شاعر کا حال یہ تھا کہ۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

کسی کی گلیاں کسی کے کوچے، کسی کا سنگ آستان بس یہی حدِ نگاہ تھی۔ ان گلیوں میں صبح سے شام اور شام سے صبح کرنا۔ ان کوچوں میں دن کو رات اور رات کو دن بنانا۔ اس سنگ آستان پر سر پھوڑنا اور فریاد کرنا۔ محبوب سے حسرتِ التفات کا اظہار کرنا۔ رقیب رو سیاہ کی ہجو کرنا۔ کبھی شوخی کو ابتذال بنا دینا۔ کبھی ابتذال کے ڈانڈے پھکڑپن سے ملا دینا۔ ہر بات میں مبالغہ ہر بات میں جھوٹ ہر بات میں تصنّع۔

واردات اور تاثرات کا کہیں نشان نہیں۔ حقیقت اور واقعہ کا کہیں گزر نہیں عشق ہے تو زبردستی کا۔ ہجر کی داستان ہے تو فرضی۔ محبوب کا سراپا کھینچا تو اسے رشکِ زلیخا بنا دیا۔ بزمِ یار کی منظرکشی کی تو چنگیز اور ہلاکو کی سفاکی کا سماں آنکھوں کے سامنے آگیا۔ محبوب کی آنکھوں میں مسیحائی دیکھ لی۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پتی بن گئے۔ اس کے رخسار گلعذار مانے گئے۔ اس کا قہر جہنم اور التفات جنت بن گیا۔ خرامِ ناز میں قیامت کی جلوہ نمائی ہونے لگی۔ تبسّم میں بجلیاں گوندنے لگیں بے رخی اور بن گئی۔ قہر و غضب کا نام عشوہ و غمزہ قرار پایا۔ غرض اس دور کی شاعری میں آورد اور تصنّع کا رنگ غالب تھا۔ اور معدودے چند شعرا جو سوز و گداز اور درد و اثر کی نعمت سے مالامال تھے وہ بھی ایک ہمہ گیر روحانی تاثر پیدا کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔ سوسائٹی۔ قوم۔ ملت اور ملک کے لئے نہ پہلے گروہ کی شاعری مفید تھی نہ دوسرے گروہ کی۔

اقبال نے جب زبان سخن کو جنبش دی تو ان کے کانوں میں شبلی۔ حالی۔ اور اکبر کے ترانے گونجے۔ یہ ترانے نشان راہ کا کام تو دے سکتے تھے۔ لیکن جادہ نہیں بن سکتے تھے۔

شبلی کی قومی شاعری۔ وقتی سیاست اور افراد سیاست پر ایک طنز ہے۔ کوئی شبہ نہیں ان کے کلام میں جوش ہے روانی ہے۔ کیف ہے۔ اثر ہے۔ طنز کے تیر اور استہزا کے پیکان ہیں۔ لیکن یہ شاعری ملت کو کسی نصب العین کی طرف دعوت نہیں دیتی۔ کوئی مخصوص اور متعین راستہ نظر کے سامنے نہیں رکھتی۔ افراد ملت میں جوش اور ولولہ پیدا نہیں کرتی۔ اس شاعری میں تمکنت اور تحمل ہے۔ لیکن کوئی پیام نہیں۔ کوئی دعوت نہیں۔ کوئی خروش نہیں۔ کوئی اصلاحی تعمیری تخلیقی تجدیدی جذبہ نہیں۔ کوئی واضح متعین اور حیات آفریں پروگرام نہیں۔ چند نیم تاریخی اور تاریخی عنوانات ہیں جن پر طبع آزمائی کی ہے۔ وقت کی چند ہنگامی تحریکیں اور ان کے ارباب کار ہیں جن پر طنزیہ لب و لہجہ میں نکتہ چینی کی ہے۔ ظاہر ہے نہ یہ تشخیص مرض ہے نہ علاج۔ حالی کا کلام ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ ان کی تغزل کی شاعری بھی جان دار ہے۔ اور قومی شاعری بھی لیکن اگر ان سے مسدس چھین لیں۔ تو ان کی پونجی ختم ہو جائے گی۔ وہ قدیم طرز کی شاعری سے بیزار ہیں۔ انھیں مسلمانوں کی تاریخ پر فخر ہے۔ وہ مسلمانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہیں۔ اور یہ تاثر اشک و آہ کی صورت میں نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حالی کی قومی شاعری کے سارے دفتر میں وہ جوش۔ وہ گرج۔ وہ خروش۔ اور وہ ہمہمہ نہیں جو ایک انقلابی شاعری میں ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کے حال زار پر روتے ہیں۔ اور ان کا گریہ اتنا اثر آفریں ہے کہ دوسرے بھی ان کے ساتھ رونے لگتے ہیں لیکن قوموں کی تعمیر نو حسرت و ماتم کی رہین منت نہیں ہوتی۔ انقلاب اپنے جلو میں خون کا دریا گوارا کر سکتا ہے آنسوؤں کا

سمندر نہیں برداشت کر سکتا۔ اور حالی کے پاس اشک و آہ کے سوا کچھ نہیں

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر

اس میں کوئی شبہ نہیں جس وقت حالی نے اپنی قوم کے لیے صفِ ماتم بچھائی ہے اور فریاد و شیون کا سلسلہ شروع کیا ہے یہ چیز بھی خاصی موثر اور کارگر رہی سر سید نے بجا طور پر کہا تھا اگر روز قیامت خدا تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا تو اپنے ساتھ کون سا توشہ لایا ہے ؟ تو میں کہوں گا حالی کا مسدس۔ باین ہمہ حالی کا مسدس صرف اپنے وقت کی ایک بہت اچھی چیز تھا۔ وہ ایک مردہ۔ از کار رفتہ۔ زوال پذیر۔ اور غلام و محکوم قوم کے لیے زندگی قوت حرارت۔ اور آزادی کا پیام نہیں تھا۔ اس سے مرض کا کسی حد تک اظہار ضرور ہوتا تھا لیکن اس کی تعیین نہیں ہوتی تھی۔ اور علاج کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اکبر بہت بلند قوم کی انجمن پر چھا گئے وہ حکیم بذلہ سنج تھے وہ عارفِ شوخ گفتار تھے۔ مرض پر ان کی نگاہ تھی اور تھوڑے بہت چٹکلے بھی وہ مریض کو بتانے تھے لیکن مرض اور دیر پذیر مرض چٹکلوں سے دور نہیں ہوتا۔ ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کھل کر بات کر سکتے واضح اور متعین طور پر پروگرام مرتب کر سکتے۔ اور یا جوج فرنگ کو للکار سکتے وہ چٹکیاں لیتے ہیں گدگداتے ہیں وہ تہذیب فرنگ سے بیزار ہیں۔ اور اس تہذیب پر بڑی چھبتی ہوئی تنقید بھی کرتے ہیں۔ لیکن بند بند دھنی الفاظ میں تمسخر اور مزاح کے پیرایہ میں وہ مسلمانوں کے جمود سے نالاں ہیں۔ ان کی غلامی سے خفا ہیں۔ ان کی فرنگی ذہنیت پر چراغ پا ہیں۔ لیکن قدامت پرست اتنے ہیں کہ صرف پردہ ہی کے حامی نہیں انگریزی تعلیم تک کے مخالف ہیں علی گڑھ کالج تک سے بیزار ہیں۔ سر سید کی مرغوبی ان کی نظر میں عیب ہے اس لیے عیب ہے کہ وہ مسلمانوں کو تہذیب جدید سے آشنا ہونے کی دعوت کیوں دے رہے ہیں؟

شبلی کی تعلیم یہ تھی کہ کانگریس کا ساتھ دو، حالی کا پیام یہ تھا کہ وقت کے ساتھ رہو اور لاتے رہو۔ اکبر کی امنگ دور قدیم کی حمایت اور جدید کی مخالفت تک محدود تھی۔ ظاہر ہے ان میں سے کوئی مسلک بھی ایسا نہیں تھا جسے اقبال اپنا سکتے۔ ان میں کوئی مسلک طوفان بردوش نہیں تھا۔ انقلاب انگیز نہیں تھا۔ قیامت خیز نہیں تھا۔ اور اقبال اسی چیز کے جویا تھے، کہتے ہیں۔

زاغ کہ یہ سکون ہے یہ سکون ہے یا فسون ہے
نہ نہنگ ہے نہ طوفاں نہ خرابیٔ کنارہ!

بھلا جس شاعر کا مطمع نظر نہنگوں کے پنجے لڑانا اور طوفانوں سے مقابلہ کرنا ہو، جو ساحل مراد دیکھ کر جھنجھلا جاتا ہو۔ اور جسے خرابیٔ کنارہ کی حوصلہ فرسا اور ہمت شکن صعوبت سے کھیلنے میں لطف آتا ہو۔ وہ بھلا شبلی اور حالی اور اکبر کے ساتھ چند قدم بھی چل سکتا تھا؟

مقصد خدانخواستہ ان بزرگوں کی تنقیص نہیں۔ ہر شخص خواہ کتنا ہی بڑا ہو اپنے دور اور ماحول سے الگ نہیں ہو سکتا۔ شبلی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں حالی نے جس فضا میں سانس لی اکبر جس دور میں پروان چڑھے وہ ۱۸۵۷ء کے عالم آشوب غدر کے فوراً بعد کا عہد ہے غدر میں مسلمان بُری طرح کچلے اور پامال کئے گئے تھے، ہندوؤں نے ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ انگریز ان کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اس لیے کہ فرنگی حکومت کو بار بار جس قوت سے مقابلہ کرنا پڑا وہ مسلمان ہی کی تھی۔ غدر حصول اقتدار کی آخری کوشش تھی اور انگریزوں نے یقین کر دیا تھا کہ جب تک مسلمان کچلے اور پامال نہیں کیے جائیں گے ان کے شور و شر سے نجات نہیں ملے گی۔ یہی وجہ تھی کہ غدر کے بعد مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ ان کے قلعے حویلیاں اور مکانات ڈھائے گئے۔

ان کے ذرائع معاش مسدود کر دیئے گئے۔ ان کے امیروں کو غریب اور غریبوں کو فقیر بنا دیا گیا۔ ان گنت مسلمانوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا یا گیا۔ بوڑھوں۔ بیماروں بچوں اور عورتوں تک سے رحم اور انسانیت کا برتاؤ نہیں کیا گیا۔

ان لرزہ خیز حوادث سے مسلمان سہم گئے تھے۔ وہ دل کی بات زبان پہ لاتے ہوئے ہچکچاتے تھے اور ایسی کوئی بات تو ان کے منہ سے نکل ہی نہیں سکتی تھی جو انقلاب کی پیامبر ہو۔ ان کی اسلام پرستی ملت دوستی محب قوم ہر چیز اپنی جگہ غیر مشکوک اور غیر مشتبہ ہے۔ یقیناً یہ بزرگ ان حالات سے خوش نہیں تھے۔ جن میں بکھرے ہوئے تھے انہیں بدلنا چاہتے تھے لیکن آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھاتے تھے پھونک پھونک کر۔ پہلے بڑی دیر تک سوچتے تھے پھر کوئی کام کی بات منہ سے نکالتے تھے۔

کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

یہ مسلمانوں کو پھر کسی ابتلا سے دوچار کرنا نہیں چاہتے تھے اپنے قول و فعل سے مسلمانوں کو کسی نئی مصیبت میں پھنساتے ہوئے وہ ہچکچاتے تھے ان کی خواہش تھی مسلمان تباہی سے دوچار ہیں پہلے ان کی تلافی کر لیں۔ پھر اپنا کوئی سیاسی پروگرام مرتب کریں۔ اور یہ سیاسی پروگرام اکبر کے الفاظ میں

لائل سبجکٹ تم برٹش کے رہو

کی حد سے آگے نہ بڑھے۔ دار و رسن۔ قید و بند۔ گرفتاری۔ سزایابی۔ پھانسی۔ کالا پانی۔ جلا وطنی۔ ضبطی۔ قرقی کے ہجوم و تواتر نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کر دیا تھا۔ چنانچہ اس راستہ سے عام مسلمانوں کو دور رکھنے کے لیے یہ اکابر خود

8126
INDIAN INSTITUTE OF ISLAMIC STUDIES
NEW DELHI

اور غدر کے مشاہیر کا ذکر بڑی تلخ زبان اور تند لب و لہجہ میں کرتے تھے۔ ذکاء اللہ جیسا مرد ثقہ جب بہادر شاہ کا ذکر کرتا ہے۔ تو حد درجہ اہانت آمیز رنگ میں۔ سر سید جیسا مرد جلیل، عظیم جنرل محمود کو "نامحمود" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ نذیر احمد جیسا عالم دین لال قلعہ کی جنگ آزادی کا مذاق اڑاتا ہے —— شاید نیک نیتی کے ساتھ۔

اس کے برعکس اقبال کا زمانہ مذکورہ بزرگوں سے بالکل الگ اور جدا تھا۔ یہ بڑا ہنگامہ آفریں اور طوفانی دور تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے حالات ہی نہیں بدلے تھے نسلیں بدل چکی تھیں۔ وہ لوگ جنہوں نے غدر کی فتنہ سامانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور غدر کی بربادیوں کا شکار ہوئے تھے ختم ہو چکے تھے۔ اب جو نسل بنی تھی۔ وہ ایک نئے جذبے سے معمور تھی۔ یہ "قوم" انگریزی علوم و فنون سے بہرہ ور تھی۔ فرنگی دستور حیات سے آشنا تھی۔ اس نے فرنگیوں کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں جمہوریت کا سبق لیا تھا۔ غلامی سے بغاوت کا سلیقہ انگریز استادوں سے سیکھا تھا یہ غلامی پر کس طرح قائم رہ سکتی تھی؟ یہ نصف صدی پیچھے کے حوادث سے سہم کر اور لرزہ براندام ہو کر کس طرح خاموش رہ سکتی تھی۔؟

پھر یہ بھی نہ فراموش کرنا چاہیے کہ یہ دور مسلمانوں کے لیے خاص طور پر بڑا ہیجان انگیز تھا۔ اسلامی ممالک ہدفِ ستم بنائے جا رہے تھے۔ فرنگی قوموں کی ہوسِ استعمار اسلامی ملکوں کو اپنا غلام بنا رہی تھی۔ فرانس نے مراقش، الجزائر اور ٹیونس کو ہضم کر رکھا تھا۔ اطالیہ کی فوجیں طرابلس الغرب میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھیں۔

انگریز مصر کو غلام بنا چکے تھے۔ ایران پر روس کے دندان حرص دراز تیز ہو رہے تھے۔ پھر پہلی جنگ عظیم اپنی پوری فتنہ سامانیوں کے ساتھ عالم وجود میں آئی۔ اس جنگ کے دوران میں مسلمانوں کو سبز باغ دکھائے گئے۔ ان سے دل خوش کن وعدے کئے گئے۔ انہیں آزادی اور خود مختاری کی بشارت دی گئی پھر ان سے تعاون اور امداد کی التجا کی گئی۔

لیکن جنگ ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اسلامی ممالک کی تباہی اور بربادی کا حقیقی دور جنگ عظیم اول کے اختتام کے بعد ہی شروع ہوا۔ شام اور لبنان پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ عراق برطانیہ کا غلام بن گیا شرق اردن پر بھی فرنگی پرچم لہرانے لگا۔ یہودیوں سے لارڈ بالفور نے وعدہ کر لیا کہ فلسطین وطن الیہود بنا دیا جائے گا۔ مصر پر اور زیادہ سختیاں کی گئیں اور عہد یہ سے کہ سلطنت عثمانیہ ترکیہ پارہ پارہ کر دی گئی اس کے مقبوضات چھین لئے گئے۔ اس کے اعزا، عاجزانہ علیحدہ کر دیئے گئے۔ اتحادی فوجوں نے درہ دانیال سے گزر کر قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا۔ خلیفۃ المسلمین کٹھ پتلی بن گئے۔ ترکی قوم غلام بنالی گئی۔ یونانیوں نے انگریزوں کی شہ پاکر فساد انگیزیاں شروع کیں۔ اور سمرنا کے مسلمانوں پر وہ مظالم کیے جن کے تصور سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مشہد مقدس پر گولہ باری کی گئی۔ دروزی قبائل پر حریت پرستی کے جرم میں چالیس گھنٹے تک مسلسل فرانس نے گولہ باری کی۔ غرض حالات یہ تھے کہ مسلمانوں کو کہیں پناہ نہیں تھی۔ کہیں اماں نہیں تھی۔ کوئی کنج عافیت ایسا نہیں تھا۔ جہاں وہ منہ چھپا کر بیٹھ سکتے۔ دنیا کی

وسعت ان کے لیے تنگ تھی۔ کہاں جائیں کیا کریں۔ کس سے مدد مانگیں کہاں سے زخم کا مرہم تلاش کریں؟

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو اے شبلی کہاں جائیں

کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیرواں کب تک؟

اور واقعی اب شام و نجد اور قیرواں کا امن و امان بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہاں بھی استعمار کی سلطانی تھی۔ اور مسلمان بری طرح تباہ ہو رہے تھے۔ پامال کیے جا رہے تھے۔

یہ حالات تھے جب ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نیا جوش۔ ایک نیا جذبہ۔ ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ وہ غلام تھے۔ مجبور تھے۔ لیکن ان کے سینہ میں جو دل تڑپ رہا تھا وہ مجاہد کا دل تھا۔ موت سے بے خوف، خوف مرگ سے ناآشنا۔ اور جب کوئی مرنے کا تہیہ کر لے تو اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں ہوتا۔

ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ محمد علی، شوکت علی۔ اور ابوالکلام کا سکہ چل رہا تھا۔ تحریک خلافت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ مسلمانان ہند کفن سر سے باندھ کر میدان میں آ چکے تھے۔ گاندھی جی علی برادران اور مجلس خلافت کا سہارا لیکے خلافت فنڈ کے سرمایہ سے سارے ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے۔ اور کانگریس میں ہندو قوم میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ جوش و خروش کا زمانہ تھا۔ علی برادران اور ابوالکلام آزاد گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کر رہے تھے۔ بلا ارادہ اور بلا قصد قومیت متحدہ کی بنیاد پڑ رہی تھی۔ غیر محسوس اور غیر مرئی طریقہ پر ایک قومی نظریہ کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔

اقبال کی عقابی نگاہوں نے تاڑ لیا۔ یہی وقت ہے نغمۂ نمود کا۔ جس راستہ کی

جستجو تھی وہ مل گیا۔ اس ہنگامہ نے اس طوفان بلاخیز نے اقبال کی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس طوفان سے الگ رہے۔ ان کی فراست ایمانی نے محسوس کر لیا تھا کہ قومیت متحدہ کی یہ چڑھتی ہوئی ندی اتر جائے گی۔ ایک قومی نظریہ پروان نہیں چڑھ سکے گا۔ گاندھی جی۔ علی برادران اور ابوالکلام کی مساعی رائیگاں جائیں گی۔ ہندو عصبیت کبھی بھی مسلمانوں کی انفرادیت کو زندہ نہیں رہنے دے گی۔ ہندو زعماء کی سامراجی ذہنیت مسلمانوں سے "غیر مشروط سپردگی" (UNCONDITIONAL SURRENDER) کا مطالبہ کرے گی۔ مسلمانوں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی۔ ان کا جوش غلط راستہ میں صرف ہوگا۔ اور بالآخر ان کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ خود کانگریس کے اندر سے مہاسبھائی پیدا ہوئے۔ کانگریس کے لیڈروں نے اپنے عمل سے قومیت متحدہ کی نفی کی۔ کانگریس کے ان زعماء نے جو مسلمانوں میں بھی جتنے محبوب تھے۔ جتنے ہندوؤں میں مسلمانوں کے حقوق چھینے۔ انہیں ان کا حق دینے سے انکار کیا۔ وہ پنڈت موتی لال نہرو ہی تو تھے جنہوں نے صوبہ سرحد اور صوبہ سندھ کو صوبائی درجہ دینے کی مرکزی اسمبلی میں مخالفت کی جس سے بددل ہو کر بہار کے شفیع داؤدی اور مدراس کے مرتضیٰ بہادر کانگریس پارٹی سے الگ ہو گئے۔ پھر یہی موتی لال نہرو تھے جنھوں نے نہرو رپورٹ مرتب کی اور پنجاب و بنگال کی ہندو مسلم اکثریت تک کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یہی گاندھی جی تھے جنھوں نے بے جھجک لیکن بالکل خلاف واقعہ فساد کوہاٹ کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی۔ اور ایک پبلک بیان میں صاف اور واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ مسلمان دھنگی (BULLY) اور ہندو بزدل (COWARD) ہیں کانگریس کے ایک اور روح رواں سوامی شردھانند تھے۔ جنھوں نے شدھی کی تحریک چلائی۔ اور ہزاروں ملکانہ راجپوتوں کو ہندو بنانے کے پروگرام کا آغاز کر دیا۔ کانگریس کے دوسرے ستون "

لاجپت رائے تھے جو سنگھٹن کے بانی تھے۔ نتیجتاً سارے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ اور مسلمانوں پر ہندو لاٹھ حملوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا پنڈت مدن موہن مالوی جی نے جو کانگرس کے سابق صدر بھی تھے اور جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف ایک مستقل محاذ قائم کیا۔ افغانی ہوّے سے ہندوؤں کو ڈرایا۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی روح پرور تنظیم کو افتراق۔ بدگمانی۔ منافرت۔ اور دشمنی سے بدل دیا۔ صاف نظر آنے لگا کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔

اقبال کی نگاہ دوربین "آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر" دیکھ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان تحریکوں میں شریک نہیں ہوا۔ جو ہر ہندوستانی اور ہر مسلمان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ ان نعروں میں اس نے حصہ نہیں لیا۔ جو وقت کی زبان بن چکے تھے۔ اس کا ہر حلقہ میں احترام ہوتا تھا ہر گروہ اس کی شخصیت۔ سیرت۔ اور کردار سے متاثر تھا۔ علی برادران تو اسے اپنا پیر و مرشد سمجھتے تھے اور وہ خود بھی ان دونوں کے ایثار، خلوص۔ للہیت اور جوشِ کار کا قائل تھا لیکن وہ ان کی ہمراہی نہ اختیار کر سکا۔

ہندوستان قومیت متحدہ کے طوفان کی زد میں تھا اس کی مخالفت کرنا اپنی شامت کو دعوت دینا تھا۔ عزیزوں سے دشمنی۔ دوستوں سے نفرت۔ ساتھیوں سے بیزاری۔ قوم سے توہین و رسوائی مول لینا تھا۔ لیکن اس نے یہ سب مصیبتیں خوشی سے برداشت کر لیں۔ اسے طعنے دیئے گئے۔ اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اس کی توہین کی گئی۔ لیکن وہ اپنے مسلک سے منحرف نہ ہوا۔ اس کے ایک نیاز مند عبدالمجید سالک نے طنز کا تیر پھینکا۔

؎ انگریز کی دہلیز پر سر ہو گئے اقبال

لیکن اس کا جواب ایک تبسم کے سوا کچھ نہ تھا۔

اقبال نے اپنی شاعری کا، اپنی زندگی کا جو نصب العین بنایا تھا وہ اسلام کا احیاء، مسلمانوں کی سربلندی، برنارڈ شا نے محمد علی کے بارے میں جو بات کہی تھی وہ پوری صداقت کے ساتھ اقبال پر بھی صادق آتی تھی۔ یعنی ان کی تحریک، پیام اور زندگی کا مقصد صرف ایک تھا۔

عہد محمدؐ کی طرف رجعت (BACK TO MUHAMMAD)

محمد علی اور شوکت علی کی استعداد و صلاحیت نذر احباب بھی ہوئی اور نذر اغیار بھی۔ ان کا جوشِ کار۔ خلافت پر بھی صرف ہوا اور کانگریس پر بھی۔ ان کی طوفان بردوش سرگرمیاں مسلمانوں کی صلاح و فلاح کے لیے بھی وقف رہیں اور قومیت متحدہ کے لیے بھی یہ لوگ آزادی ہند کی جنگ بھی لڑے اور مسلمانوں کی انفرادیت کے لیے بھی برسرپیکار رہے۔ انہوں نے ابن سعود سے بھی ٹکر لی۔ لارڈ ارون سے بھی۔ گاندھی جی کا بھی مقابلہ کیا۔ مہاسبھا اور کانگریس کے سامنے بھی ڈٹے رہے۔ اس طرح ان کی قوت مختلف محاذوں پر صرف ہوتی رہی۔ ان کا طوفان گھٹتے گھٹتے موج تنک آب بن گیا۔

لیکن اقبال نے صرف ایک ہی محاذ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اس نے دوسرے تمام محاذوں سے دامن بچائے رکھا۔ اسلام کا احیاء اور مسلمانوں کی سربلندی بس یہی ایک محاذ تھا جس پر اس کی تمام صلاحیتیں صرف ہو رہی تھیں۔ اسی محاذ پر کام کرتے کرتے اس نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

شاعر صرف گل و بلبل کی باتیں کرتے ہیں عشق و محبت کے ترانے گاتے ہیں۔ وصل و فراق کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ وہ دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

LIBRARY New Delhi-62

دنیا والوں کی سرگرمیوں اور تحریکوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ وہ میدانِ عمل کے مرد نہیں ہوتے۔ صرف خیال کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اس دنیا سے باہر نکلنے کا تصور بھی نہیں کرتے لیکن اقبال اس کلیہ کا ایک استثنا تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ مجاہد بھی۔ اور سالارِ کارواں بھی۔ اس نے سوتوں کو جگایا اس نے مردوں میں زندگی کی حرارت پیدا کی۔ اس نے رہبروں اور رہنماؤں کی جادۂ صحیح کی طرف نشان دہی کی۔ وہ اپنے گوشۂ عافیت سے باہر بہت کم نکلا۔ لیکن اس کا یہی گوشۂ عافیت رزمگاہِ حق و باطل بنا ہوا تھا۔ یہاں سے زندگی اور حرارت کے سوتے پھوٹتے اور چشمے ابلتے تھے یہاں سوز و گداز کی نعمت تقسیم ہوتی تھی یہی وہ کارگاہِ فکر تھی جہاں حرم کے بھٹکے ہوئے آہو کو پھر وسعتِ صحرا حاصل کرنے کا نسخہ بتایا جاتا تھا۔

"اقبال اور ملی سیاست" اسی حقیقت کا بیان ہے۔ اقبال کی شاعری نے اقبال کی فکر نے۔ اقبال کی اسلامیت نے مسلمانانِ ہند و پاکستان کی سیاست پر ان کے مستقبل پر ان کی ہیئتِ اجتماعی پر ان کی روزمرہ کی زندگی پر ان کے طرزِ فکر اور مقصدِ حیات پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اگر اقبال نہ ہوتا تو مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ فرنگیت کے سیلاب میں غرق ہو چکا ہوتا۔ اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر چکا ہوتا۔ اپنی تاریخ سے بیگانہ ہو چکا ہوتا۔ اپنی خودی سے محروم ہو چکا ہوتا۔ اپنی قومی اور ملی انفرادیت کا بھولے سے خیال بھی نہ کرتا۔ وہ اقبال ہی تھا جو میدان میں آیا۔ اور جس نے اپنی قوم کے نونہالوں اور نوجوانوں کو للکارا

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے!

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں

کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا

تمدن آفرین خلاقِ آئینِ جہاں داری:

وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا!

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں؟

"بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے

کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے!

جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا!

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں

مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی!

کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی

ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اس کی یہ للکار بے نتیجہ نہ رہی اس نے اپنی قوم کو خلوص سے مخاطب کیا تھا۔ قوم نے توجہ سے اس کی بات سُنی۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

اور وہی قوم جو فرنگیت سے مرعوب ہو کر تہذیب جدیدہ کی پرستار بنتی جا رہی تھی جس کے افراد و اشخاص ہندو اکثریت سے دہشت زدہ اور متاثر ہو کر سیاست وطن میں برادران وطن کی اندھی تقلید پر اتر آئے تھے۔ اقبال کی اس للکار کے بعد چونکے۔ ٹھٹکے۔ سنبھلے۔ اور اپنا راستہ بدلنے پر مجبور ہو گئے۔ اب ان میں قومی انفرادیت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ اپنے ماضی پر اپنی تاریخ پر اپنے اسلاف واکابر پر فخر کرنے لگے۔ پہلے وہ اپنی اسلامیت پر اپنے مسلمان ہونے پر شرماتے تھے۔ اب اسلام ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ ان کی فکر کا سانچہ بدل گیا ان کی ذہنیت کا رُخ بدل گیا۔ ان کا طرز حیات بدل گیا۔ اب تک وہ ایک ہندوستانی کی حیثیت سے معاملات و مسائل پر غور کرتے تھے۔ اب ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ معاملات و مسائل کو پرکھنے لگے۔ لندن۔ برلن۔ اور پیرس کے وہ سند یافتہ مسلمان جو اسلام کو عہد رفتہ کی ایک یادگار تصور کرتے تھے۔ اب اسے ایک ضابطہ حیات ایک نظام اخلاق۔ ایک دستور زندگی تسلیم کرنے لگے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے روشن خیال تجدد پسند اور بے راہ رو جوان جو مذہب کا مذاق اڑاتے تھے۔ اقبال کی نوائے سحر گاہی سے ایسے بدلے کر کٹر مسلمان بن گئے۔ فکر و نظر کا یہ بہت بڑا انقلاب تھا۔ اور اس کا سہرا بڑی حد تک اقبال ہی کے سر باندھا جا سکتا ہے جس زمانہ میں کہ نظر علما تکفیر و تفسیق میں لگے ہوئے تھے۔ کفر سازی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اسلام کا دعویٰ کرنے والوں کو اسلام سے خارج کر رہے تھے۔ اور جب صوفیان با صفا ارباب جبہ و عمامہ اور اصحاب حال و قال اپنے باہمی مسائل اور مشاغل میں الجھے اور گتھے ہوئے تھے۔ اسلام ہدف مطاعن

بنایا جا رہا تھا۔ اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ ایک شخص جس نے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ جس نے لندن اور جرمنی میں استادان فرنگ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا تھا۔ جو فلسفہ کا ڈاکٹر تھا۔ میدان میں آیا نہ یہ کسی خانقاہ کا متولی تھا۔ نہ کسی مدرسہ اسلامیہ کا مہتمم نہ اس نے کسی دینی دار العلوم سے سند فضیلت حاصل کی تھی۔ نہ یہ واعظ شعلہ مقال تھا۔ نہ خطیب شیریں نوا۔ لیکن اس کے پاس خلوص للہیت اور حب دینی کی نعمت تھی۔ اسی ایک چیز نے اس کی باتوں میں اثر پیدا کیا اور دیکھتے دیکھتے سالار کارواں بن گیا۔

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا!

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

واقعی اقبال کے ترانے نے بانگ درا کا کام کیا۔ اور ملت اسلامیہ کا کارواں اسے سنتے ہی سرگرم عمل ہو گیا۔

اقبال اور سیاست ملی کا ربط و تعلق واضح کرنے اور اس سلسلہ میں اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے اس موضوع کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

۱۔ اقبال کے خطوط ——— اقبال کے نجی اور پرائیویٹ خطوط کا جو مجموعہ طبع و اشاعت کی منزل سے گزر چکا ہے۔ اسے پیش نظر رکھیے تو اس میں مختلف اور متعدد مقامات پر وہ چنگاریاں دبی ہوئی نظر آئیں گی جو آگے چل کر شعلہ بنیں اور جنھوں نے اقبال کی زندگی کو یکسر شعلہ و شرر بنا دیا۔ پھر یہی چنگاریاں فروغ جادواں بن کر قوم میں منتقل ہوئیں اور اس کا نتیجہ بالآخر پاکستان کی صورت میں رونما ہوا۔

۲ - ایک سیاسی قائد کی حیثیت سے اقبال کی رفتار و گفتار ـــــــــــ اقبال نے عملی سیاست میں بہت کم حصہ لیا۔ لیکن ہندوستان اور مسلمانان ہند کی سیاسی جدوجہد کا وہ دور جو ہنگاموں۔ فسادوں، خونریزیوں، کشمکش، تصادم، ہندو مسلم مفاہمت کی کوششوں اور ان کی پیہم ناکامیوں، آزادئ ہند کی سعی و کوشش، اصلاحات سیاسی کے نفاذ، گول میز کانفرنس، انڈیا ایکٹ کی صورت میں صوبائی خودمختاری اور مسلم لیگ کے دور جدید پر مشتمل تھا ایسا نہ تھا جس سے اقبال جیسا حساس مفکر اپنے آپ کو الگ کر سکتا۔ اس دور میں وہ پنجاب اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے، گول میز کانفرنس کے رکن کی حیثیت سے، مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے، سائمن کمیشن کے معاون کی حیثیت سے، نہرو رپورٹ کے مخالف کی حیثیت سے اور سب سے آخر میں قائد اعظم کی قیادت عظمیٰ کے داعی کی حیثیت سے، غرض مختلف اور متنوع حیثیتوں سے جہد و عمل کا پیکر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تقریریں بھی کیں۔ بیانات بھی دیئے۔ سیاسی معاصرین سے برسر پیکار بھی رہے۔ محمد علی سے بھی جھڑپ ہوئی۔ جواہر لال نہرو سے بھی ٹکر لی۔ بہت سے واقعات پیش آئے اور سیاست ملی کے مورخ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان عہد آفریں واقعات و حوادث کو نظر انداز کر دے۔ اختصار سے تو کام لیا جا سکتا ہے لیکن ان کی اہمیت کو اجاگر نہ کیا جائے۔ یہ اپنے موضوع کے ساتھ شدید ترین بے انصافی ہوگی لہذا یہ دوسرا حصہ انہی احوال و واقعات کی منظر کشی اور داستان سرائی پر مشتمل ہے۔

۳ - اقبال کی شاعری ـــــــــــ اقبال کا اصل سرمایہ ان کی شاعری ہی ہے مسلمانان ہند کی قومی اور ملی سیاست پر یہ شاعری اس طرح اثر انداز ہوئی کہ اس نے اس کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ دنیا کے کسی شاعر نے اپنی قوم کو وہ کچھ نہیں

دیا جو اقبال نے دیا۔ دنیا کے کسی شاعر نے اپنی قوم کی اس طرح رہنمائی نہیں کی جس طرح اقبال نے کی۔ دنیا کے کسی شاعر نے اپنی قوم کے حال اور مستقبل پر اتنا گہرا اثر نہیں ڈالا جتنا اقبال نے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اقبال کی شاعری کے اس پہلو کو جو اب تک بالکل اچھوتا ہے نمایاں کیا جائے، اور بتایا جائے کہ اس کی شاعری کا پس منظر کیا ہے۔ اس کی شاعری نے کیسے کیسے مسائل پیدا کیے۔ اور یہ شاعری ملت اسلامیہ کے ان گنت معاملات و مسائل پر کس طرح اثر انداز ہوئی۔ اپنی ملت کو اقبال نے کس طرح جھنجھوڑا۔ بیدار کیا۔ اور صراطِ مستقیم پر گامزن کر دیا؛ یہ داستان دلچسپ بھی ہے۔ اور طویل بھی۔ ہم نے دلچسپی باقی رکھی ہے۔ طوالت کم کر دی ہے۔ لیکن کسی اہم واقعہ کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور سیاست ملی کا موضوع اتنا اہم اور تفصیل طلب ہے کہ

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

لیکن وقت کی کوتاہی اختصار پر مجبور کر رہی ہے۔ اور یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اس موضوع کو اس کے جملہ متعلقات کے ساتھ پوری شرح و بسط اور تفصیل و اطناب کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ بہر حال اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ پہلی کوشش ہے۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کامیاب فرمائے ــــ

رئیس احمد جعفری

۱۲- دسمبر ۱۹۵۷ء

۸۹- ٹیگور پارک - لاہور

اپنا بیان، اپنی زبان

یا رب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ
در بادہ نشّہ را نگرم، آں نظر بدہ!

اپنا بیان اپنی زبان

سیاست ملی سے اقبال کا تعلق اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک اقبال کو نہ سمجھ لیا جائے، جب تک یہ نہ معلوم کر لیا جائے کہ اقبال خود اپنے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں؟ اپنے تصورات و خیالات کی بنیاد و اساس کیا قرار دیتے ہیں؟ سیاست کا مفہوم ان کی نظر میں کیا ہے؟ اور اس سیاست پر وہ کس پہلو سے گفتگو کرتے ہیں؟

سیاست کا عام طور پر جو مفہوم مراد لیا جاتا ہے، اقبال کا مفہوم اس سے قطعاً الگ ہے سیاست کا نام آتے ہی عام طور پر جو بات سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ سیاست نام ہے کسی قومیت کے فروغ و ارتقا کے وسائل و ذرائع مہیا کرنے کا۔ اس سلسلہ میں بہت سی باتیں "سیاسی" بن جاتی ہیں ہر جا و بے جا موقع پر اپنی قوم کی حمایت، اپنے قومی فائدے کے لئے دوسری قوموں کو نقصان پہنچانا، ذراسی قومی منفعت پر دوسری قوموں کے بڑے سے بڑے نقصان کی پروا نہ کرنا، قومی عصبیت کو فروغ دینا، جوڑ توڑ سے کام لینا۔ بے بات کی بات پر جنگ کرنا اور جنگ کے دوران میں ہر غلط سے غلط اور ناجائز سے ناجائز بات کو روا سمجھنا، دوسروں کو دکھ دینے کے لئے حق و باطل کا خیال نہ کرنا۔ حریف کو شکست دینے کے لئے جائز و ناجائز حدود سے تجاوز

کرجانا۔ یہ اور اس طرح کی دوسری تمام حرکتیں "سیاست" میں داخل سمجھی جاتی ہیں۔

لیکن اقبال کی سیاست مذہب کی تابع تھی وہ "قیصر" اور کلیسا کی انفرادیت کے قائل نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان مذہب کو الگ رکھ کر، مذہب سے بیگانہ رہ کر ترقی نہیں کر سکتے، فروغ حاصل نہیں کر سکتے، ان کے ہر کام میں ہر فعل میں، ہر اقدام میں مذہب کی روح کارفرما رہنی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں، ان کی سیاست میں ان کی تقریر میں، تحریر میں، تنقید میں، تبلیغ میں، تلقین میں، فلسفہ میں، ہر چیز میں، مذہب کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ کسی تحریک میں شریک ہوتے ہیں تو اسی نقطۂ نظر سے کسی تحریک کی مخالفت کرتے ہیں تو اسی بنیاد و اساس پر۔ کسی نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر کہ مذہب اس کے بارے میں کیا کہتا ہے؟ کسی نظریہ کی تردید کرتے ہیں تو اس لئے کہ وہ مذہب سے ہم آہنگ اور ہم نوا نہیں ہے۔

اقبال کی زندگی میں بہت سی تحریکیں اٹھیں، ابھریں، پروان چڑھیں، ہندوستان میں آزادی کی لہر اٹھی، ممالک اسلامیہ میں خود مختاری کی تحریک ابھری، مشرق وسطیٰ میں زندگی کی حرارت پیدا ہوئی، ترکوں میں تورانیت کی تحریک نے جنم لیا، روس میں ایک نظام اشتراکیت نمودار ہوا، اطالیہ میں فاشیت، جرمنی میں نازیت، اسپین میں آمریت مسلمانان ہند میں خلافت مسلم لیگ، مسلم کانفرنس، مجلس اتحاد ملت، مجلس خدام کعبہ اور کئی جماعتیں اور تحریکیں بڑھیں اور پھیلیں، فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری نے تحریک صیہونیت کی نشوونما میں مدد دی۔ ان سب تحریکوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ فکری طور پر یا عملی طور پر اقبال نے حصہ لیا۔ لیکن حصہ لینے سے پہلے اچھی طرح یہ دیکھ لیا کہ ان کا مذہب اس بارے میں کس طرح کی راہ نمائی کرتا ہے۔ یہ معلوم کئے بغیر انھوں نے ایک قدم

بھی آگے نہیں بڑھایا۔

اقبال کو، اور ان کے مذہبی خیالات و تصورات کو سمجھنے کے لئے لابدی ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اقبال اپنے خیالات، نظریات، اسلوب فکر و نظر، دعوت اور پیام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اور ان کی فکر و نظر پر مختلف حلقوں سے جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کا جواب وہ کیا اور کس طرح دیتے ہیں؟ یہ معلوم کئے بغیر اقبال کو اور ان کی سیاست کو سمجھنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس پہلے حصّہ کا آغاز اس عنوان سے کیا ہے۔

(۱)

انقلابی مقصد

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور نے اقبال کی شاعری کے عنفوان شباب کے زمانہ میں ان کی شاعری اور اس کے پیام و مقصد پر ایک تنقیدی مقالہ لکھنے کا خیال ظاہر کیا اور اپنے اس ارادہ کا اظہار ایک مکتوب میں کیا۔ اس کا جواب لکھتے ہوئے اقبال نے اپنے خیالات پر خود تبصرہ کر ڈالا۔

اس تبصرہ کا حسب ذیل حصّہ خاص طور پر غور طلب ہے۔ یہ مکتوب ۱۹۱۹ء کا ہے۔

> "تبصرہ کے متعلق مشورہ ہوگا کہ میرا مجموعہ شائع ہو تو لکھئے فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں۔ جس کا قریباً نصف حصّہ لکھا جا چکا ہے۔ کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی۔ کچھ اردو میں۔ کلام کا بہت حصّہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں تاہم

جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔ اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں کیا عجب اگلی نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جان کاہی چاہتا ہے۔ اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔ غرض یہ کہ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لئے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے۔ اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگزشت میں بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں۔ اور یہ سرگزشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں۔ اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔"

اقبال اپنی یہ سرگزشت کبھی نہ لکھ سکے۔ لیکن ان کے خطوط میں یہ سرگزشت بکھری ہوئی نظر آجاتی ہے۔ اس کے مختلف ٹکڑے جوڑ کر ہم نے ایک داستان تیار کر لی ہے، جو دل آویز بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔

(۲)

ایک غلط فہمی کی تردید

مذہب، سیاست، قوم اور ملت کے بارے میں اقبال کے جو خیالات تھے وہ اُن

کے خود اپنے تھے کسی سے مستعار نہیں لیئے گئے تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ مستعار خیالات میں وہ جوش وہ ولولہ وہ طنطنہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ جو اپنے ذہن و دماغ کے پیدا کردہ خیالات سے پیدا ہوتا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کا "تذکرہ" شائع ہوا۔ اس کے مقدمہ میں مرتب نے غلط اور بالکل غیر ضروری طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اقبال کی نغمہ سنجی مولانا آزاد کے "الہلال" کی صدائے بازگشت ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء) میں اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہیں۔

"مولانا ابوالکلام کا "تذکرہ" آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں۔ ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں، نظم و نثر انگریزی و اردو موجود ہیں جو غالباً مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہر حال اس کا افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے، نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی ہے۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔"

(۳)

خاص مقاصد

اقبال کی شاعری وقت گزارنے کا مشغلہ نہیں تھی۔ "آرٹ" نہیں تھی۔ پیشہ ورانہ طور پر بھی اس فن کی طرف انہوں نے توجہ نہیں کی تھی۔ انہوں نے شاعری کو اپنے بلند خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ وہ اپنی شاعری کی داد نہیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شاعری سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کا پیام زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ سکے۔ اور ایسے دل آویز طور پر کہ جو سنے اس کے دل میں اتر جائے۔

اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۲۰ اگست ۳۵ء) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"میں نے نہ کبھی اپنے آپ کو شاعر سمجھا۔ اس واسطے کہ کوئی میرا رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے کبھی مجھے دلچسپی نہیں رہی، ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ :۔

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

(۴)

چند اعتراضات اور اُن کا جواب

اقبال کی شاعری پر، ان کے اسلوب سخن پر۔ شاعری میں اسلام کی دخل اندازی پر ان کے اسلامی تصورات پر متعدد حلقوں کی طرف سے اعتراضات کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لیکن اقبال ایسے ایرادات و اعتراضات پر کم توجہ کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا مخالف کی باتوں کا جواب نہ دینا ہی بہترین جواب ہے۔ لیکن اگر اعتراض سنجیدگی کے ساتھ کیا جاتا تھا تو وہ اس کا جواب دیتے تھے۔ اور اپنے مقاصد و تصورات کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اقبال پر چند اعتراضات کئے گئے۔ یہ اعتراضات بہ ظاہر وزنی بھی تھے اور سنجیدہ بھی۔ اقبال نے ان کا جواب شرح و بسط کے ساتھ دیا ذیل میں ہم الگ الگ چند مخصوص اعتراضات اور ساتھ ساتھ اقبال کے جوابات درج کرتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے اس طرح اقبال نے نہ صرف معترض کے ایرادات کا شافی اور کافی جواب دے دیا۔ بلکہ اپنی شاعری اور اس کے اسلوب و مقصد کے بارے میں بھی بڑے دل نشین طور پر روشنی ڈالی ہے۔

(۵)

حدودِ خودی کی تعیین

معترض کا اعتراض یہ تھا کہ اقبال جو اپنی شاعری میں بار بار خودی کا ذکر کرتے ہیں

اس کا مقصد کیا ہے؟ نیز خودی کی تکمیل اور ارتقاء اور اسلام کے مابین کس طرح کا رشتہ ہے؟ آیا رشتہ ہے بھی یا نہیں؟

اقبال نے اس اعتراض کا جواب سنجیدگی کے ساتھ دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا حسن استدلال اور عالمانہ طرز تکلم بھی اپنی جگہ پر ایک خاص چیز ہے، فرماتے ہیں!

"دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شئے پر مقدم ہے نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے لئے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔ خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا۔ مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانے میں حبشہ کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں۔ دوسری صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہر حال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک سرایت کر جاتے ہیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اس کا نام بقا رکھا ہے۔ لیکن ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلۂ فنا کی تفسیر فلسفۂ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارۂ محض ہے۔ میرے عقیدہ کی رو سے یہ تغیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تغیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔"

اقبال کے کلام میں بار بار "خودی" کا لفظ پڑھ کر اگر کسی کے دل میں کھٹک پیدا ہو سکتی ہے تو وہ اس تشریح کے بعد رفع ہو جانی چاہیئے۔

(۱)

جہاد اور جنگ

معترض کا ایک اعتراض یہ تھا کہ اس دورِ انتشار میں اقبال جنگ و پیکار کے حامی ہیں۔ اور اپنی شاعری میں وہ اس مقصد کے لئے لوگوں کو ابھارتے ہیں گویا ایک مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ شمشیر بدست رہے بجز اس کے نہ وہ سچا مسلمان بن سکتا ہے نہ اس کے اسلامی خصائص پروان چڑھ سکتے ہیں۔

اقبال اس غلط خیال کی تردید کرتے ہیں اور جنگ و جہاد کے اصولی فرق پر گفتگو کرتے ہوئے اشارہ فرماتے ہیں۔

"میں جنگ کا حامی نہیں ہوں نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کی تعلیم کی رو سے یہاں جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جب کہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور اُن کو گھروں سے نکالا جائے۔ مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے۔ (نہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم

ہے ۔ ۹۰۹ ہم میں بیان ہوا ہے ۔ ان آیات کو غور سے پڑھیئے، تو آپ کو معلوم
ہوگا کہ وہ جس چیز کو سیموئل ہور جمیعت اقوام کے اجلاس میں COLLECTIVE
SECURITY کہتا ہے ۔ قرآن کریم نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت
سے بیان کیا ہے ۔ اگر گذشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیین قرآن کریم پر
تدبر کرتے تو اسلامی دنیا کی جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج صدیاں گذر گئی ہوتیں
جمیعت اقوام جو زمانۂ حال میں بنائی گئی ہے اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ
جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل
سکتی جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا ۔
جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے ۔ علی ہذا القیاس
دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے ۔"

جنگ اور جہاد کے اس فرق کو اگر ملحوظ رکھا جائے تو پھر غلط فہمی پیدا ہونے کا
امکان ہی نہیں رہتا ۔

(ج)

شاہین

اقبال کے کلام میں "شاہین" کا نام کثرت سے آیا ہے ۔ یہ پرندہ بڑا جنگ جو ہوتا ہے ۔
شکاری ہوتا ہے ۔ دوسرے کمزور پرندوں کو زندہ نہیں رہنے دیتا ۔ معترضوں کا ایک اعتراض
یہ بھی تھا کہ اقبال شاہین کا جو اس تواتر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں یہ ان کی جنگ جو فطرت
کا ثبوت ہے ۔

لیکن اقبال اس اعتراض کو نہیں مانتے وہ فرماتے ہیں

"شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہہ نہیں۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ خود دار اور غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔

۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔

۳۔ بلند پرواز ہے۔

۴۔ خلوت پسند ہے۔

۵۔ تیز نگاہ ہے ———"

اقبال کی اس تشریح کے بعد صورت حال کتنی واضح ہو گئی ہے۔؟

۵

اقبال کے مغربی تنقید نگار

اقبال پر جس طرح ان کے وطن میں افراد ملت کی طرف سے تنقید و تنقیص کا سلسلہ جاری تھا۔ اس طرح یورپ میں بھی جیسے جیسے اقبال کے افکار و خیالات پھیلتے جاتے تھے معاندانہ، مخالفانہ اور غلط فہمی پیدا کرنے والے تنقیدی مغالات کا سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا تھا۔

اس سلسلہ میں ہمیں اقبال کے اس مکتوب سے بڑی مدد ملی۔ جو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام تحریر فرمایا تھا۔ اس مکتوب میں ان مغربی تنقید نگاروں کے اعتراضات ایرادات بھی آگئے ہیں۔ جو اقبال کے پیام اور دعوت پر کئے جاتے تھے اور وہ جواب بھی

آگیا ہے، جو اقبال نے ان کے توہمات و خیالات کا دیا ہے۔ مکتوب خاصا طویل ہے۔ ہم اس کے خاص خاص پہلوؤں پر اکتفا کریں گے۔ صورت مسئلہ کو زیادہ صاف اور واضح کرنے کے لئے ہم نے اعتراضات اور ان کے جواب کو الگ الگ سرخیوں کے ماتحت درج کیا ہے:

(الف)

نٹشے اور اقبال

اقبال کے "انسان کامل" اور جرمن فلسفی نٹشے کے مافوق الانسان کے فرق کو نہ سمجھنا اور ان دونوں کو گڈمڈ کر کے یہ الزام لگانا کہ اقبال کے خیالات ان کے اپنے نہیں۔ دوسرے سے ماخوذ ہیں۔ وہ جس بات کو بڑے زوردار طریقہ پر پیش کرتے ہیں۔ وہی بات ان کے مغربی پیش رو بہت پہلے کہہ چکے ہیں۔ ایک خلاف واقعہ اور خلاف حقیقت بات کو اچھالنا اور غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

اس اعتراض کی تردید کرتے ہوئے اقبال ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں:

"بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے۔ دھوکہ کھایا ہے اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں۔ دی اتھنیم والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ بہت حد تک غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ لیکن صاحب مضمون نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے۔ اگر اسے ان کی صحیح تاریخ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشو و ارتقا کے متعلق اس کا زاویہ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا۔

وہ انسان کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ یہی

وجہ ہے کہ اس نے غلط مبحث کر کے میرے انسان کامل اور جرمن مفکر کے مافوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے۔ میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسان کامل کے متصوفانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب نہ نطشے کے عقائد کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا۔ نہ اس کی کتابیں میری نظروں سے گذری تھیں مضمون "انڈین کیوری" میں شائع ہوا۔ جب ۱۹۰۸ء میں میں نے ایرانی الہیات پر ایک کتاب لکھی تو اس کتاب میں اس کو شامل کر لیا گیا۔

انگریزوں کو چاہیئے کہ میرے خیالات کو سمجھنے کے لیے جرمن مفکر کے بجائے اپنے ایک ہم وطن فلسفی کے افکار کو راہ نما بنائیں۔ میری مراد میگزنڈر سے ہے جس کے گلاسگو والے خطبات پچھلے سال شائع ہو چکے ہیں ان خطبات میں ہیں نے خدا تعالیٰ اور الوہیت کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے وہ صفحہ ۳۴۷ پر لکھتا ہے:۔

"گویا ذہن انسانی کے نزدیک الوہیت دوسری اعلیٰ تخریبی قوت ہے۔ جسے کائنات عالم وجود میں لانے کی سعی کر رہی ہے۔ قیاس اور اجتہاد کی رہنمائی سے یقین ہو چکا ہے کہ بطن گیتی میں اس قسم کی ایک قوت موجود ہے۔ لیکن ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے۔ ہم نہ خود اسے محسوس کر سکتے ہیں۔ نہ ہمارا ذہن اس کے تصور پر قادر ہے۔ انسان ابھی تک ایک نامعلوم خدا تعالیٰ کے لئے قربان گاہیں تعمیر کر رہا ہے۔ یہ معلوم کرنا کہ الوہیت کیا چیز ہے۔ اس کا احساس کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں ممکن ہے کہ ہم خدا بن جائیں ——————"

الیگزنڈر کے خیالات میرے عقائد کی نسبت زیادہ جسارت آمیز ہیں میرا عقیدہ

ہے کہ کائنات میں جذبۂ الوہیت جاری و ساری ہے۔ لیکن میں الیگزنڈر کی طرح یہ نہیں مانتا کہ یہ قوت ایک ایسے خدا کے وجود میں جلوہ آرا ہوگی۔ جو وقت کا تابع ہوگا۔ اس باب میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قوت ایک اکمل و اعلیٰ انسان کے پیکرِ خاکی میں ظاہر ہوگی خدا تعالیٰ کے متعلق میرا عقیدہ الیگزنڈر کے عقیدے سے مختلف ہے، لیکن اگر انگریز ان جزوی اختلافات قطع نظر کر کے انسان کامل کے تخیل پہ اپنے ایک ہم وطن مفکر کے افکار کی روشنی میں نظر ڈالیں تو انہیں یہ عقیدہ اس قدر اجنبی اور غیر مانوس نہیں معلوم ہوگا۔

(ب)

انسانِ کامل کی تلاش

مسٹر ڈکنس نے اقبال کے انسان کامل پر کچھ اعتراضات کئے تھے۔ ان میں ایک اعتراض یہ تھا کہ "وہ جنگ و پیکار کی دعوت دیتے ہیں"!

اقبال نے اس اعتراض کو بڑی خوبی اور حسن استدلال کے ساتھ رد کیا ہے اور دل نشین پیرایہ میں بتایا ہے کہ ان کے نزدیک انسان کامل کا مفہوم کیا ہے۔ قوت اور حرب و پیکار کو وہ کس وقت اور کس حد تک جائز سمجھتے ہیں؟ وہ ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں۔

"مسٹر ڈکنس کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے اعمال قرار دیا ہے۔ انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔

مسٹر ڈکنس نے صحیح فرمایا کہ جنگ خواہ حق و صداقت کی حمایت میں ہو۔ خواہ ملک گیری اور فتح مندی کی خاطر تباہی اور بربادی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کے استیصال کی سعی کرنا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، پنچایتیں اور کانفرنسیں استیصال حرب نہیں کر سکتیں۔ اگر اس سعی میں کامیابی ہو بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ ملل مستعمرہ جن ملتوں کو تمدن نہ تہذیب میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتیں اپنے ظلم اور جور و تعدی کا شکار بنانے کے لئے زیادہ پر امن وسائل اختیار کریں گی حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشری مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے۔ ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور اعلیٰ اخلاق کی بنیاد مستحکم و استوار کر دے۔ پروفیسر میکنزی کی کتاب "انٹروڈکشن ٹو سوشیالوجی" کے یہ دو آخری پیراگراف کس قدر صحیح ہیں۔ میں انہیں لفظ بہ لفظ نقل کر دیتا ہوں۔

"کامل انسان کے بغیر سوسائٹی معراج کمال کو نہیں پہنچ سکتی اور اس غرض کے لئے محض عرفان اور حقیقت آگاہی ہی کافی نہیں۔ بلکہ ہیجان اور تحریک کی قوت بھی ضروری ہے جیسے یوں کہنا چاہیے کہ یہ معمہ حل کرنے کے لیے ہم نور و حرارت دونوں کے محتاج ہیں۔ غالباً عہد حاضرہ کے معاشری مسائل کا فلسفیانہ فہم و ادراک بھی وقت کی اہم ترین ضرورت نہیں۔ ہمیں معلّم بھی چاہیئے اور پیغمبر بھی ہمیں آج رسکن یا کارلائل یا ٹالسٹائی جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ جو ضمیر کو زیادہ سخت گیر بنا دیں اور فرائض کے دائرے کو زیادہ وسیع کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے۔"

یہ قول صحیح ہے کہ عہد حاضر کو محض بیابان کی صدا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ عہد حاضر کے بیابان آباد شہروں کے گلی کوچے ہیں۔ جہاں ترقی کی مسلسل و پیہم جد و جہد کا بازار گرم ہے۔ اس عہد کے پیغمبر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ہنگامہ زار میں وعظ و تبلیغ کرے

غالباً ہمیں پیغمبر سے بھی زیادہ عہد نو کے شاعر کی ضرورت ہے۔ یا ایک ایسے شخص کا وجود ہمارے لئے مفید ثابت ہوگا۔ جو شاعری اور پیغمبری کی دو گونہ صفات سے متصف ہو۔ عہد حاضر کے شاعروں نے ہمیں فطرت سے محبت کرنے کی تعلیم دی ہے۔ انہوں نے ہمیں اس قدر بلند نگاہی میں ڈال دیا ہے۔ کہ مظاہر فطرت میں ہم انوارِ ربانی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم ابھی ایک شاعر کے منتظر ہیں۔ جو ہمیں اس وضاحت کے ساتھ پیکرِ انسانی میں صفات الٰہی کے جلوے دکھائے۔ کسی مفکر نے ازراہ تفنن اپنے آپ کو روح القدس کا سپاہی کہا تھا۔ ہمیں ایسے شخص کی ضرورت ہے جو در حقیقت روح القدس کا سپاہی ہو جو اس حقیقت پر ہماری آنکھیں کھول دے کہ ہمارے بلند ترین نصب العین روزمرہ کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں اور اگر اس زندگی کو ترقی دینے کی سعی کی جائے تو ہمیں محض راہبانہ ریاضت اور نفس کشی ہی کا موقع نہیں ملے گا۔ بلکہ ایسا ارفع و اعلیٰ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ جو تمام خیالات، تمام جذبات اور تمام مسرتوں کو ترقی کے بلند مقام پر پہنچا سکتا ہے۔ انگریزوں کو چاہئے کہ اس نوع کے خیالات کی روشنی میں انسان کامل کے متعلق میرے افکار کا مطالعہ کریں۔ ہمارے عہد نامے، اور پنچائتیں جنگ و پیکار کو صفحۂ حیات سے محو نہیں کر سکتیں۔ کوئی بلند مرتبہ شخصیت ہی ان مصائب کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

(ج)

فلسفۂ سخت کوشی

فلسفۂ اقبال کے اس پہلو پر بھی مسٹر ڈکنسن کو اعتراض تھا۔ اقبال نے خالص فلسفیانہ انداز لیکن بہت سلجھے ہوئے پیرایہ میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا ہے۔ وہ ڈکنسن کے اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفۂ سخت کوشی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا مدار علیہ وہ خیالی ہے جو میں نے حقیقت کے متعلق اپنی نظموں میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطہ سے ربط و امتزاج پیدا کر کے "کل" کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں اور یہ تصادم لامحالہ ان کی شیرازہ بندی پر منتج ہوگا دراصل بقائے شخص اور زندگی کے علو و ارتقاء کے لئے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نیٹشے بقائے شخص کا منکر ہے۔ جو لوگ حصولِ بقا کے آرزومند ہیں۔ وہ ان سے کہتا ہے "کیا تم ہمیشہ کے لئے زمانے کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو" اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے ہیں کہ زمانہ کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اس نے کبھی مسئلہ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بخلاف اس کے میرے نزدیک بقاء انسان بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گراں مایہ ہے جس کے حصول کے لئے انسان اپنی تمام صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے، ضروری سمجھتا ہے اور میرے نزدیک ان سے زیادہ استحکام و

استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر میں نے سکون وجمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض خیال آرائیوں تک محدود ہو مردود قرار دیا ہے میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں حالانکہ اس باب میں نیٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ جدید طبعیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مادّی قوت کے جزو نے ہزارہا سال تک ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ پھر بھی وہ فانی ہے اور اسے مٹا دیا جا سکتا ہے۔ جسم انسانی کے ذرہ یا پرمانو کی بھی یہی کیفیت ہے۔ صدہا برس کی بد وجہد اور تصادم و پیکار کے بعد وہ موجودہ صورت تک پہنچا ہے۔ پھر بھی اس کی بے ثباتی اور عدم استحکام ظاہر ہے اگر وہ بدستور قائم رہنا چاہتا ہے تو وہ یقیناً ماضی کے درس عبرت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اسے لامحالہ ان قوتوں سے اپنے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑے گی جو آج تک اس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کرے۔ یا ان میں سے بعض کو (تصادم اور جنگ و پیکار کو جو استحکام کے قوی عوامل میں سے ہیں)۔ جو اس کے ارتقاء کے کفیل نہیں ہے بالکل مٹا دے اور اس کے استحکام و بقا کی خاطر بعض ایسی قوتیں منصۂ شہود میں لے آئے جن سے انسان آج تک ناآشنا رہا ہے۔ لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس باب میں کسی نصب العین کا پرستار نہیں ہوں۔ اس لئے میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی دور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگ عظیم میں انسان کی بصیرت و معرفت کا جو سرمایہ

پنہاں ہے۔ وہ اس سے عرصۂ دراز تک متمتع نہ ہو سکے گا۔

ان سطور سے واضح ہوگیا ہے کہ میں نے محض اخلاقی زاویۂ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا۔ افسوس کہ مسٹر ڈکسن نے فلسفۂ سخت کوشی کے اس پہلو کو نظرانداز کر دیا۔"

(۶)

اقبال کا فلسفہ عالمگیر ہے یا محدود؟

اقبال پر زور و شور کے ساتھ ایک اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ وہ اپنا مخاطب دنیا کو نہیں بناتے مسلمان کو بناتے ہیں۔ وہ انسانیت کو متوجہ نہیں کرتے۔ اسلامی سوسائٹی اور اسلامی معاشرہ ہی تک اپنی فکری اور ذہنی سرگرمیوں کو محدود رکھتے ہیں۔ جب کبھی اقبال اور ٹیگور کا موازنہ و مقابلہ کیا جاتا تھا تو یہ بات بڑی بلند آہنگی کے ساتھ فرمائی جاتی تھی کہ ٹیگور عالمی شاعر ہے۔ وہ انسانیت کا پرستار ہے۔ اقبال اسلامی شاعر ہے۔ وہ صرف مسلمانوں سے سروکار رکھتا ہے۔ اس فرق کو ظاہر کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ ٹیگور وسیع القلب ہے اور اقبال تنگ دل۔

بالکل یہی بات بدلے ہوئے الفاظ میں اور بدلے ہوئے لب و لہجہ میں اقبال کے مغربی ناقد بھی کہتے ہیں۔ ان کا بھی یہ خیال ہے کہ گو اقبال کے فلسفہ میں عالم آشوبی کی صلاحیت ہے۔ گو یہ فلسفہ ساری دنیا کے لئے ابرِ کرم بن سکتا ہے۔ لیکن اقبال اپنی تنگ دلی کے باعث اسے محدود کر دیتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی بات اس کی اسلامی برادری کے سوا کسی اور حلقہ تک بھی پہنچے۔

کوئی شبہ نہیں کہ بہ ظاہر یہ اعتراض بڑا اہم اور وزنی ہے۔ لیکن اقبال نے جس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ اس غلط مفروضے کے تار و پود بکھیرے ہیں وہ انھی کا حصہ ہے۔ اس نے اس "جرم" کا اعتراف کیا ہے لیکن اعتراف اتنا دل کش ہے کہ پھر جرم جرم نہیں رہتا۔ عین صواب بن جاتا ہے۔ اقبال ڈاکٹر نکلسن کو لکھتے ہیں۔

"مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالم گیر ہے۔ لیکن باعتبار انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اسے موثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے۔ جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہے لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے۔ نہایت کامیاب حریف رہا ہے انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ دراصل اسلام بلکہ کائنات انسانیت کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کر دیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ

قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافی حدود ملک پر ہے۔ دنیائے اسلام میں استیلاء حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے ایک مسلمان ہمدرد نوع کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقاء ہے۔ نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں۔ کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ اور کہتا ہے

تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم

میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدا تعالیٰ کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں۔ اور ایک دوسرے

کی شخصیت تسلیم کرلیں ۔ انجمنیں ، حکمبرداریاں عہدنامے انسان کو فوزو فلاح سے آشنا نہیں کر سکتے ۔ انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حریت میں پنہاں ہے آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ سائنس کا محل استعمال قطعی طور پر بدل دیا جائے ۔

ان نیند سیاسی منصوبوں سے احتراز کیا جائے جن کا مقصد یہ ہے کہ کمزور و زبون حال یا ایسی اقوام جو عیاری اور حیلہ گری کے فن میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں ۔ صفحۂ ہستی سے غیست و نابود ہو جائیں ۔ مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں ۔ انہوں نے بھی فتوحات کیں ہیں ۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں ۔ لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری اسلام کے مقاصد میں داخل نہیں تھیں ۔"

ایک اہم نکتہ

اپنے اس مکتوب میں اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو مخاطب کر کے ایک بڑا اہم نکتہ بیان کیا ہے ۔ اسلام اور مسلمان فرمانروا اور ان کی جہانگیری و کشور کشائی کے مابین ربط و تعلق کو واضح کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں اور کتنی پتے کی بات کہتے ہیں ۔

" اسلام کو جہان ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بے حد مضر تھی ۔ اس طرح وہ اقتصادی اصول

نشو ونما نہ پا سکے۔ جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث نبوی میں جا بجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں کہ اسلامی اصولوں کی گہرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

اسلام کا مقصد یقیناً یہ ہے کہ دوسری قوموں کی جداگانہ حیثیت مٹا ڈالے اور انہیں اپنے اندر جذب کر لے۔ بلکہ صرف اسلام کی سیدھی سادی تعلیم جو الٰہیات کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقل انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے۔ اس عقیدہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے۔ اسلام کی فطرت میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں جن کے بدولت وہ کامیابی کے بام بلند پر پہنچ سکتا ہے۔ ذرا چین کے حالات پر نظر ڈالئے۔ جہاں کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی اور لاکھوں انسان اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ میں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں اور اس طویل عرصہ نے مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصد اسلام کی وکالت نہیں۔ بلکہ میری قوت طلب و جستجو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کوشش میں

ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے۔ جس کا مقصد وحید ذات پات رتبہ و درجہ رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دیتا ہے اسلام دینوی معاملات کے باب میں نہایت نرم بھی ہے اور پھر انسان میں بے نفسی اور دینوی لذائذ و نعم کے اثبات کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔"

(۸)

جدید اور قدیم

خط کے آخر میں ڈاکٹر نکلسن کو مخاطب کر کے اقبال نے یورپ کے "جدید" اور اسلام کے "قدیم" پر جو بات کہی ہے وہ انہی جیسا مجمع البحرین کہہ سکتا تھا کہ وہ قدیم کے بھی رمز آشنا تھے اور جدید کے شناسا بھی۔ کہتے ہیں۔

"میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان صوفیاء اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے اور وقت کے متعلق برگساں کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔ قرآن کریم الہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے۔ پوری قطعیت کے ساتھ کہا گیا ہے "یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الہیات کے ہی مسائل سے ہے۔ عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہب، تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جس کا مبداء اور سر چشمہ قرآن مجید ہے۔ تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ جدید افکار کو

قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے ناآشنائے محض ہیں۔ اے کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا۔ کہ دنیا کی مختلف قوموں کے خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔"

نفیِ عصبیّت

هنوز از بندِ آب و گل نہ رستی
تو گوئی رُومی و افغانیم من
من اوّل آدمِ بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تُورانیم من

(۴)

مذہبیت

یہ بات تعجب انگیز تھی کہ اقبال از سرتا پا مذہبی امیال و عواطف کے علم بردار تھے۔ انہوں نے کسی دینی درسگاہ میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ کسی مولوی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کسی خانوادۂ تصوف سے بھی وابستہ نہیں تھے۔ مذہبی ماحول میں بھی ان کی زندگی بسر نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے انگریزی اسکول۔ انگریزی کالج اور انگریزی یونیورسٹی میں تحصیلِ علم کی۔ انگریز اساتذہ سے کسب علم کیا۔ لندن میں تکمیل مزید کی۔ پھر جرمنی پہنچے وہاں سے ڈگری لی۔ ایک جگہ سے بیرسٹر بنے دوسری جگہ سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ بہ ظاہر انہیں مذہب سے، مذہبیت سے، قوم سے، ملت سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ وقت کے عام اونچے تعلیم یافتہ طبقہ کا معمول تھا۔ لیکن جیسے جیسے علوم فرنگ کے اسرار و رموز ان پر منکشف ہوتے گئے۔ ان کی مذہبیت ترقی کرتی گئی۔ بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بات بات پر یہ دینی تقشف اور مذہبی احتیاط کا اظہار کرنے والا شخص کوئی ملائے مسجد ہے۔ لیکن یہ جذبہ اپنی شخصیت کے تحفظ کے لیے ان میں نہیں پیدا ہوا تھا۔ بلکہ بدو شعور

سے کار فرما تھا۔ مولانا ابوالکلام کے "تذکرہ" سے اقبال کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا ہو سکتی تھی۔ اور "تذکرہ" کے مقدمہ میں اقبال کی مذہبیت اور دینداری سے متعلق جو غلط فہمی پیدا کی گئی تھی۔ اس کی تردید کرتے ہوئے وہ فرما چکے ہیں کہ میرے یہ خیالات آج سے نہیں ۱۹۰۷ء سے ہیں جب کہ "الہلال" افق صحافت سے طلوع نہیں ہوا تھا۔ اس عنوان کے ماتحت ہم اقبال کی مذہبی ذہنیت اور دینی عواطف پر روشنی ڈالیں گے۔

(۱)

نذرانہ یا رشوت؟

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور سے (مکتوب مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء) ایک بہت معمولی سے مسئلہ پر استفسار کرتے ہیں۔ لیکن یہی معمولی مسئلہ اقبال کی نظر میں کس درجہ اہم تھا۔

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلاء کے پاس جب متعلقات پیشی کے لیے آتے ہیں۔ تو ان میں سے بعض پھل پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیے لاتے ہیں۔ یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں۔ کیا یہ مال مسلمانوں کے لیے حلال ہے؟"۔

یہ اتنا عام اور روز واقعہ ہے کہ اس کے بارے میں کسی کے دل میں کوئی کھٹک پیدا ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اقبال اس سے یونہی نہیں گذر جاتے مذہبی نقطہ نظر سے اپنا اطمینان چاہتے ہیں۔

(۲)

قرآن کا مسلک

اقبال کو اس بات پر اصرار تھا کہ انھوں نے جو مسلک دین و سیاست کے معاملات و مسائل میں اختیار کیا ہے۔ وہ قرآن سے پورے طور پر مطابق ہے۔ غیر قرآنی مسلک کے قبول و اختیار کا ان کے نزدیک سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے مسئلہ خلافت کی دینی اور مذہبی حیثیت پر جو معرکۃ الآرا مقالات سپرد قلم کئے تھے۔ ان کی داد دیتے ہوئے ۱۴ مئی ۱۹۲۲ء کے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں۔

"اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکہ ڈال دیا ہے۔ تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ خلافت پر جو مضامین آپ نے لکھے نہایت قابل قدر ہیں۔ ان سب کو ایک علیحدہ رسالے کی صورت میں شائع ہونا چاہیئے"۔

(۳)

اسلام ناآشنا مسلمان

اپنے مذہبی امیال و عواطف سے تو اقبال پورے طور پر مطمئن تھے۔ یورپ کی الحاد آمیز فضا بھی انہیں جادۂ استقامت سے منحرف نہ کر سکی۔ مذہب دشمنوں کے مجمع میں بھی وہ اپنے مذہب پر فخر کرتے رہے۔ لیکن ہر شخص تو اقبال نہیں تھا۔ وہ دیکھتے تھے۔ اور افسوس کے ساتھ دیکھتے کہ وہ نوجوان جو مسلمان گھرانوں کے چشم و چراغ ہیں۔ جن کے

آباؤ اجداد نے اسلام کے لیے گراں بہا خدمات انجام دیئے تھے۔ جنھیں آج اسلام کا ترجمان اور نقیب ہونا چاہیے۔ اسلام سے کتنے دور جا پڑے ہیں۔ نئی تعلیم نے انہیں مذہب سے کس درجہ ناآشنا اور بیگانہ بنا دیا ہے یہ دیکھ کر ان کے دل میں یہ دھڑکا پیدا ہوتا تھا۔ کہیں یہ نوجوان نسل جو رفتہ رفتہ مذہب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ بالکل مذہب سے بیزار اور متنفر نہ ہو جائے۔؟

علامہ سید سلیمان ندوی کو اپنے ایک مکتوب (۲۴۔ اپریل ۲۱ء) میں لکھتے ہیں۔

"میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر انتہائی اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرے۔ حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا۔ مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں۔ تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

(۴)

نظامِ اسلام

دنیا نے فلاحِ انسانیت سے متعلق بہت سے تجربے کر لیے۔ ملوکیت، جمہوریت، عوامیت آمریت لیکن ان میں سے کوئی تجربہ بھی انسانیت کے درد کا درماں نہ بن سکا انسانیت اور زیادہ زبوں ہوتی گئی۔

اقبال یہ منظر دیکھ کر سوچتا ہے کہ ان تجربوں کے علاوہ دنیا آج سے چودہ سو برس پہلے ایک اور تجربہ بھی کر چکی ہے۔ اسلامی نظام ایک بہت مختصر سی مدت کے لیے دنیا کے ایک خطہ میں بہ عہد خلافتِ راشدہ نافذ ہوا تھا۔ اور اس نظام نے انسانیت کا ہر دکھ دور کر دیا۔ وہ اس کے ہر زخم کا مرہم بن گیا تھا ——— کیا وہ نظام آج کام نہیں آسکتا؟ کیا وہ نظام آج کی دکھی انسانیت کو سکون۔ قرار۔ اطمینان اور عافیت کی نعمت مہیا نہیں کر سکتا؟

کلکتہ میں جمعیت علمائے ہند کا سالانہ اجلاس ہو چکا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مسندِ صدارت پر جلوہ آرا تھے۔ ان کا خطبۂ صدارت علمی اور فکری اعتبار سے ایک بڑی اہم دستاویز ثابت ہوا۔ یہ خطبہ پڑھ کر اقبال سید صاحب کو مخاطب کرتے ہیں۔

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے۔ اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہادِ عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) حالتِ نزاع میں ہیں۔ غرض کہ نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک عامل ہو سکتا ہے اس مبحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے۔ اور اگر کوئی کتابیں ایسی ہوں جن کا مطالعہ اس ضمن میں مفید ہو تو ان کے ناموں سے آگاہ فرمائیے۔"

(۵)

میرا دل مومن ہے

اقبال کو ان کے علمی خدمات کے سلسلہ میں حکومتِ ہند نے نائٹ ہڈ (KNIGHTHOOD)

سے نوازا گیا۔ سر ہو گئے اقبال "۔ ان کے ایک مزاج شناس اور دیرینہ دوست میر غلام بھیک نیرنگ نے اس اعزاز پر مبارک باد دی۔ ساتھ ہی ساتھ اس اندیشہ کا اظہار کیا کہ کہیں اس اعزاز کے ساتھ ان کے فکری اور مذہبی خیالات میں "نیازمندی" نہ پیدا ہو جائے۔ اس کا جواب دیتے ہیں۔ (۴۔ جنوری۔ ۱۹۲۳ء)

"آپ کا خط ابھی ابھی ملا ہے۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا مگر جس دنیا کے ہم اور آپ رہنے والے ہیں۔ اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آئے ہیں اور آئے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے۔ کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے۔ سو قسم ہے۔ خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ اور آبرو ہے۔ اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا تعالے پر ایمان ہے۔ اور مسلمان کہلاتا ہوں دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشا اللہ۔

اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے "۔

اقبال کی زندگی آگے چل کر عشق رسول کا پیکر بنی۔ اس کی چنگاریاں اس خط میں بھی دیکھ لیجیے ——— "قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا تعالیٰ پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں ——— ان سادہ سے الفاظ میں عشق رسول کی رفعت بڑی آسانی سے ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اپنے علاوہ اگر کسی اور میں بھی اقبال کو یہ جذبہ نظر آتا تھا۔ تو اس کے اعتراف میں تامل نہیں کرتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کو ایک خط میں (۷۔ اپریل۔ ۱۹۲۲) مولانا محمد علی جوہر

رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"سہروردی کے نعتیہ کلام کو میں نے بھی خاص طور پر نوٹ کیا ہے۔ بلکہ میں تو ان کے روحانی انقلاب کو ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں"۔

(۱۸)

علی گڑھ سے امیدیں

علی گڑھ مسلمانانِ ہند کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ مسلمانوں کی نئی نسل یہیں پروان چڑھ رہی تھی اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل اسی نئی نسل سے وابستہ تھا۔ لیکن اگر یہ نسل مذہب سے بیگانہ رہی تو کیا ہوگا؟ اقبال چاہتے تھے۔ علی گڑھ کے نوجوانوں میں مذہبی جذبہ پروان چڑھانے کی کوششیں جاری رہیں۔ اور جب کبھی اس کی جھلک دیکھ لیتے تو بہت خوش ہوتے۔ اس سلسلہ میں ایک چٹھی بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی کا حسب ذیل ٹکڑا (مورخہ ۵ جنوری ۱۹۳۰ء) ملاحظہ ہو۔

"میں ایک ہفتہ کے لیے علی گڑھ گیا تھا۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے سید راس مسعود بہت مستعد آدمی ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کی مساعی سے ... یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہو گئی ہے۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں۔ اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہبیت کے خلاف اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں۔ مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام کے لیے تڑپ ہے۔ لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی

زندگی قلوب پر موثر ہو۔"

(۷)

اسلام اور سوشلزم

روس کی اشتراکیت نے دنیا کو متحد کر دیا۔ گویا بندۂ مزدور کی تمام مصیبتوں اور پریشانیوں کا مداوا مل گیا۔ سوشلزم کے جوشِ حمایت میں لوگ اتنے بڑھ گئے کہ اسلام انہیں ایک ناکارہ نظام نظر آنے لگا۔ یہ حرکت اگر عیسائیوں یا دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے سرزد ہوتی تو ایک بات بھی تھی کہ ان کا مذہب ہر قسم کی فلاحِ انسانی کی تدابیر سے معرا ہے لیکن اسلام کے پرستار بھی اگر اس غلط راستے پر چلیں تو اس سے بڑھ کر افسوسناک بات کیا ہو سکتی ہے!

اقبال یہ صورتِ حال دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ اور ایک مکتوب (مورخہ ۱۷۔ اکتوبر ۳۶ء) میں دردمندی کے ساتھ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں۔ مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا۔ باقی رہا سوشلزم۔ سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔ جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

(۸)

لندن یا مصر؟

ایک صاحب "اسلامیات" کی تکمیل کے لیے دیارِ فرنگ کا رختِ سفر باندھتے ہیں۔ اقبال یورپ کے دانش کدوں سے بہت کچھ حاصل کر چکے ہیں۔ نظرِ قدر رہ صلاح و مشورہ کے لیے ان پر پڑتی ہے۔ لیکن وہ اس سوال پر تلملا جاتے ہیں۔ اسے برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی مسلمان اپنا وقت اس طرح ضائع کرے۔ فرماتے ہیں اور کتنے دل سوزی کے انداز میں فرماتے ہیں (۱۹۳۷ء)

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے۔ فرانس۔ جرمنی۔ انگلستان۔ اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں۔ جن کو عالمانہ تحقیق اور انکشافِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے۔ سادہ لوح مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں آپ کے بلند مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے لیے یورپ جانا بے سود ہے۔

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں!

مصر جائیے۔ عربی زبان میں مہارت پیدا کیجیے۔ اسلامی علوم اسلام کی دینی اور سیاسی تاریخ۔ تصوف۔ فقہ۔ تفسیر کا بغور مطالعہ کر کے محمد عربیؐ کی اصل روح تک پہنچنے کی کوشش کیجیے۔"

یہ روح اگر ملے گی تو اسلامی حلقوں ہی میں مل سکتی ہے۔ فرنگی دانش گاہوں میں

کیا ملے گی!

(۹)

ترک اور اسلام

ترکوں کے الحاد۔ بے دینی۔ اسلام بیزاری۔ تجدد اور فرنگیت کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ حساس مسلمان ان خبروں کو پڑھ کر دکھ اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔ لیکن اقبال کی بصیرت اور فراست ترکوں سے بدگمان نہیں تھی۔ ایک مکتوب (۱۰ فروری ۱۹۳۶ء) میں فرماتے ہیں۔

"ترکوں کے متعلق مایوس نہ ہونا چاہیے۔ ان کے ایک خدا پرست جرنیل کے الفاظ ہیں" یہ الحاد کی ہوا آئی ہے۔ کچھ دن کے بعد نکل جائے گی۔" جو کچھ ہوا جذبۂ وطن پرستی بلکہ توران پرستی کا نتیجہ تھا۔

اب جو عراق افغانستان۔ ایران۔ ترک کے معاہدہ کی تجویز ہو رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے توران پرستی کو، بحیثیت ایک پالیسی کے ترک کر دیا ہے۔ "کافر تورانی شد ناچار مسلمان شو" حالات اس قسم کے ہیں کہ ترک اسلام کو چھوڑ کر کبھی من حیث القوم سرسبز نہیں ہو سکتے۔"

اور بالآخر واقعات نے ثابت کر دیا کہ اقبال نے ترکوں کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی وہ غلط نہیں تھی۔ آخر کار انہیں اسلام کی طرف رجعت کرنی پڑی۔

(۱۰)

عشقِ رسولؐ

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ سے اقبال کو عشق تھا۔ ذیل کا مکتوب (مورخہ ۱۳۔ اگست ۱۹۱۸ء) ملاحظہ ہو۔

"کل شام سے طبیعت نہایت مشتعل ہے۔ وکیل اخبار لکھتا ہے۔ کہ کسی انگریزی اخبار نے مدینہ منورہ کی بہت توہین کی ہے۔ کمزوروں کے پاس بددعا کے سوا اور کیا ہے۔"

(۱۱)

مسلمانوں کی نوجوان نسل اور مذہب

اقبال کو نوجوان نسل سے بڑی امیدیں تھیں۔ اسے جب وہ مذہب سے ناآشنا دیکھتے تو کڑھتے تھے۔ اور جب کوئی ایسا موقعہ مل جاتا کہ اس کے کان تک مذہب کی آواز پہنچا سکیں تو اس سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔

اکبر الہ آبادی کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

"پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر ہیگ چیچک کی بیماری سے دفعتاً انتقال کر گئے۔ اور انجمن حمایت اسلام۔ لاہور کے اصرار پر دو ماہ کے لیے کالج کے ایم اے کی کلاس مجھ کو لینا پڑی۔ یہ لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آتے ہیں۔ انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ وہ ہے۔ جسے اصطلاح کلام

میں تاریخ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی میں (طلبہ کو) آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا۔
میں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا۔ خبر نہیں تھی یہ کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تل کر نظر بھی مجھ کو ملی ہے۔ ناپ کے۔ سبحان اللہ کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ۔
بہر حال ان لیکچروں کے بہانے سے ان لڑکوں کے کان میں کوئی نہ کوئی نکتہ ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے۔

جان حاضر ہے مگر راہ خدا نہیں ملتی!

میں آپ کا مقصود خوب سمجھتا ہوں۔ سیدھے سادے الفاظ میں حقائق بیان کر دینا آپ کا خاص حصہ ہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔"

(۱۲)

پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ اور جشنِ صلح

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴-۱۹۱۸) ختم ہو چکی ہے۔ انگریز فاتح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے حریف شکست سے دوچار ہوئے ہیں۔ جرمنی کا قیصر ولیم بھاگ کر ایک دوسرے ملک ہالینڈ میں پناہ گزین ہے۔ جرمنی کی فوجی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ تاوان جنگ کا بہت بڑا بوجھ اس کے دوش ناتواں پر لاد دیا گیا ہے۔ ترکیہ نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا۔ وہ بھی شکست کے نتائج بھگت رہا ہے۔ اس کے مقبوضات چھین لیے گئے۔ اس کے حصے بخرے کیے جا رہے ہیں۔ مسلمانان ہند سے جو وعدے حکومت نے کیے تھے۔ وہ فراموش کر دیئے گئے ہیں۔ ان حالات میں "جشن صلح" منایا جاتا ہے۔ ٹوڈی اور سرکار پرست اس میں حصہ لیتے ہیں لیکن اقبال —

"سردی کا خوب زور ہے۔ جشن صلح کی تیاریاں بھی ہیں۔ آج رات سرکاری عمارتوں پر چراغاں کیا جائے گا۔

لاہور کے مسلمانوں نے ایک عام جلسے میں یہ قرار دیا ہے۔ کہ جشن صلح میں شرکت نہ کی جائے۔ اس جلسہ میں میں بھی شریک تھا۔ پولٹیکل جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اس جلسہ میں اس واسطے شریک ہوا۔ کہ ایک بہت بڑا مذہبی مسئلہ زیر بحث تھا۔

(۱۵ر دسمبر – ۱۹ء)۔ !"

ملّتِ اسلامیہ اور اُس کا مشن

رگِ مسلم زسوزِ من تپید است
زچشمش اشکِ بیتابم چکید است
هنوز از محشرِ جانم نداند!
جہاں را با نگاہِ من ندید است

○

(۳)

ملّتِ اسلامیّہ اور اُس کا مشن

اقبال کی نگاہ میں ملت اسلامیہ ایک ایسی قوم تھی جو اپنا ایک خاص مشن رکھتی تھی۔ وہ دنیا کی اصلاح کے لیے نمودار ہوئی تھی۔ وہ ایک خاص پیغام ایک خاص نظام ایک خاص دستور۔ اور ایک خاص اصول کی حامل تھی۔ اس نے دنیا کو بہت کچھ دیا۔ لیکن ابھی بہت کچھ دینا باقی تھا۔ اس قوم سے دنیا نے بہت کچھ لیا۔ لیکن ابھی تک وہ اس کی محتاج تھی۔ ضرورت مند تھی۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس قوم و ملت پر غفلت اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے یہ فراموش کر دیا کہ وہ دنیا میں کیوں آئی تھی۔

ہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے؟

جب کبھی موقع ملتا ہے۔ اقبال ملت اسلامیہ کے افراد اور اکابر کو بھولی ہوئی حقیقت یاد دلاتے رہتے ہیں۔

جوہرِ مسلمانی

مولانا سید سلیمان ندوی اپنے ایک ذاتی سانحہ کا ذکر کرتے ہیں۔۔ اقبال انہیں تسلی دیتے

ہیں۔ لیکن اس تسلی میں بھی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ جاری ہے۔ اپنے جوابی مکتوب (مورخہ ۲ر دسمبر۔ ۱۹۱۹ء) میں فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ آپ کو اطمینان قلب عطا فرمائے۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "میرے ساتھ خدا تعالیٰ کا معاملہ عجیب ہے۔" گویا تمام ملت مرحوم کے احساسات کا ترجمان ہے۔ جو قوم ایک مشن لے کر پیدا ہوئی ہے۔ اس کی روحانی تربیت کے لیے ابتلا کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ ایک انگریز مصنف جسے ابتلا کے دور رس نتائج کا تجربہ ہو چکا تھا۔ لکھتا ہے کہ دکھ دیوتاؤں کی ایک رحمتِ عظیم ہے۔ تاکہ انسان زندگی کے ہر پہلو کا مشاہدہ کر سکے۔ آپ امت محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں۔ اور اس طرح من اللہ قوم کے خاص افراد کو ہی امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔ فرقۂ یاسیہ کو چھوڑ چھوڑ کر فرقہ رجائیہ میں آجائیے۔ جس حقیقت کو آپ زیر پردہ دیکھ چکے ہیں۔ اس کی بے نقابی کا زمانہ قریب ہے۔ انشاء اللہ۔

"زمانہ باز بے فروخت ؟ نمود۔!
کہ بے نقاب شود جوہر مسلمانی"

۲

قلندر

مولانا سید سلیمان ندوی ہی کو ایک اور خط میں مخاطب کرتے ہیں۔ اس خط میں کانگرس سے ان کی رجعت پر مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کس جوش و جذبہ سے فرماتے ہیں۔

"آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے۔

قلندراں کہ بزہ تو سخت می کوشند
ز شاہ باج ستانند خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمند بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکان در آغوشند
دریں جہاں کہ جمال تو جلوہ ہا دارد
ز فرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند

آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں۔ اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔!"

(۳)

نازک زمانہ

ایک صاحب مسلمانوں میں عسکری جذبہ پیدا کرنے کے لیے ایک حربی اسکول کی طرح بیل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اقبال کو یہ معلوم کر کے گویا دل کی مراد مل گئی۔ خوش ہو گئے۔ اور اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ فرماتے ہیں۔

"اسلام کے لیے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔۔۔ انشاء اللہ آپ کا ارادہ اس مقصد کے حصول کی وجوہ پیدا کرے گا۔ علماء میں مداہنت

آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیہ اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں۔ اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے۔ مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے۔"

(۴)

بھولا ہوا سبق

اقبال جانتے ہیں کہ وہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے یورپ کے ظلمت کدہ میں علم کی شمع جلائی۔ وہ اس حقیقت کے بھی شناسا ہیں کہ سائنس جدید کی حیرت انگیز ترقیوں کا پس منظر مسلمان حکماء کی تحقیق و تدقیق میں پوشیدہ ہے۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ عہد حاضر کا مسلمان جدید سائنس اور سائنس دانوں سے مرعوب ہے۔ مگر اسلامی تاریخ کے حکماء کے علمی و ذہنی کارناموں سے ناواقف محض ہے۔ تو انہیں دکھ ہوتا ہے۔ اس دکھ کا اظہار وہ اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:۔

"یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپ میں جذبۂ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔ کئی لحاظ سے محض اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جاسکتا ہے۔ اس اہم حقیقت کا احساس نہ آج کل کے یورپین کو ہے۔ اور نہ مسلمانوں کو کیونکہ مسلمان حکماء کے جو کارنامے محفوظ ہیں۔ وہ ابھی تک یورپ، ایشیا اور افریقہ کے کتب خانوں میں منتشر اور غیر مطبوعہ شکل اور حالتوں میں ہیں۔ آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے۔ کہ جو کچھ بڑی حد تک خود ان کے تمدن

سے برآمد ہوا ہے۔ وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مسلمان کو یہ معلوم ہو کہ آئن سٹائن کے نظریہ سے ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث و مباحثے ہوا کرتے تھے (ابوالمعالی جن کا قول ابن رشد نے نقل کیا ہے) تو آئن سٹائن کا موجودہ نظریہ انہیں اجنبی نہ معلوم ہو۔ اس کے علاوہ جدید استقرائی منطق سے جو بیگانگی ہے۔ وہ بہت کچھ کم ہو جائے۔ اگر اس کو یہ معلوم ہو کہ جدید منطق کا تمام نظام رازی کے ان مشہور و معروف اعتراضات سے وجود میں آیا جو انہوں نے ارسطو کی استخراجی منطق پر عاید کئے تھے۔

اس قسم کے عالموں کو تیار کرنا از بس ضروری ہے کیونکہ جدید علم سے اخذ و جذب کرنے میں صرف یہی لوگ مدد کر سکتے ہیں۔"

سیاستِ وطنی

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ "اِنَّ الملوک"
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری
خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِّ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تُو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داری کی ہے جنگِ زرگری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تُو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

(۴)

سیاستِ وطنی

وطنی سیاست میں اقبال نے بہت کم حصہ لیا۔ وہ عمل کے آدمی ہی نہیں تھے ۔ دنیائے فکر و تخیل کے شہریار تھے ۔ لیکن ان کی زندگی میں ایک موقعہ ایسا بھی آیا جب وہ اپنی وضع و روش کے خلاف سیاست کے میدان میں کود پڑے ۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمان ایک طرف برطانوی شاہنشاہیت اور سامراجی مقاصد کا ہدف بنے ہوئے تھے ۔ دوسری طرف ہندو اکثریت انہیں پامال کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ان دونوں میں بظاہر لڑائی تھی۔ لیکن درحقیقت یہ دونوں اس بات پر متفق تھے کہ مسلمانوں کی انفرادیت ختم کر دی جائے ۔ وہ ایک ایسا مشتِ غبار بن جائیں ۔ جسے ہوا کا ہر جھونکا اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر منتشر کر دے ۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال کو کوئی حساس اور خود دار مسلمان برداشت نہیں کر سکتا تھا ۔ اقبال خلوت گزینی اور خلوت پسندی کے باوجود میدان میں کود پڑے ۔ اور اپنے مقدور بھر بلکہ سچ تو یہ ہے کہ استطاعت سے زیادہ اس اندیشہ ناک صورتِ حال کو دفع کرنے میں مصروف و منہمک ہو گئے ۔

عملی طور پر اقبال نے سیاستِ وطنی میں کتنا اور کیسا حصہ لیا۔ اس پر شرح و بسط سے ہم اس کتاب کے دوسرے حصے میں بحث و گفتگو کریں گے ۔ اس حصہ میں ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ سیاستِ وطنی کے سلسلہ میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا ؟ ۔ موقف کیا تھا؟

یہ نقطۂ نظر' اور موقف جتنی خوبی اختصار اور جامعیت کے ساتھ نجی اور پرائیویٹ خطوط سے ظاہر ہو سکتا ہے اتنا بیانوں اور تقریروں سے نہیں۔ اس لئے کہ پبلک طور پر انسان جو کچھ کہتا ہے۔ اس میں بہت سے ذہنی تحفظات (MENTAL RESERVATIONS) بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن پرائیویٹ خطوط میں یہ بات نہیں ہوتی۔ انسان کھل کر اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتا ہے۔

(۱)

وفدِ خلافت

مولانا محمد علی کی زیر سیادت ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت کا ایک وفد یورپ گیا تھا۔ اس کے ارکان میں سید حسن مرحوم اور علامہ سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ ہندوستان کی ہنگامہ آرائیوں میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک عالم دین کو عالم دین کی حیثیت سے اتنی اہم ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کی رائے عامہ کے سامنے خلافت اور ترکیہ سے متعلق مسلمانان ہند کے جذبات اور احساسات رکھے جائیں۔ اور وزرائے برطانیہ کو یہ باور کرایا جا سکے۔ کہ اگر انہوں نے ترکوں کے ساتھ ظلم و ستم۔ ناانصافی۔ اور شرارت کی پالیسی جاری رکھی۔ تو اس کا ردِ عمل ہندوستان میں بہت خراب اور خطرناک ہو گا۔

وفد نے اپنے مقدور بھر سب کچھ کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے خالص علمی۔ مذہبی اور تاریخی انداز میں مسلمانوں کا مقدمہ پیش کیا۔ لیکن ڈھاک کے وہی تین پات۔ وفد کی ناکام واپسی پر اقبال نے ایک مختصر سا خط مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا۔ ان چند سطروں میں جس دلآویز طریقہ پر دل کی بات زبان پر لائے ہیں۔ اور

انگریزوں کی سامراجی ذہنیت پر جو جچی تلی رائے ظاہر کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بین الاقوامی سیاست اور اس کے موثرات و عوامل پر ان کی کیسی گہری نظر تھی۔

نز لکھتے ہیں (۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰؁ء)

"(سفر یورپ سے) مراجعت مع الخیر۔ مبارک!

آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے۔ اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے"۔

انومن بشر مثلنا و قومھما لنا عابدون

تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا کرے گا۔ امید ہے آپ کی صحت اچھی ہوگی۔!"

والسلام مخلص محمد اقبال۔

(۲)

ہندو مسلم اتحاد

مجلس خلافت ایک عرصہ دراز تک گاندھی جی اور کانگرس کو آزادی ہند کے بارے میں پیکر اخلاص سمجھتی رہی۔ اور اس سلسلہ میں اس نے بڑے ایثار سے کام کیا۔ جب ملک میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے۔ مسلمان اقلیت

۱۔ کیا ہم اپنے ہی جیسے (دو آدمیوں) موسیٰ اور ہارون کی بات مان لیں۔ حالانکہ ان کی قوم ہماری غلام ہے۔

پر عرصۂ زندگی تنگ کیا جا رہا تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریک زور شور سے شروع ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف زہریلی اور اشتعال انگیز تقریریں کی جا رہی تھیں۔ مجلس خلافت اپنے موقف پر قائم تھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کی مبلغ اور داعی تھی وہ ہندوؤں پر کوئی اثر نہیں رکھتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کو برابر یہ تلقین کر رہی تھی کہ وہ صبر سے کام لیں۔ مشتعل نہ ہوں اور آزادی وطن کی خاطر ناگوار باتیں بھی برداشت کر لیں۔

اقبال اس اصول کے قائل نہیں تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد پر ملت کا مفاد قربان کرنے کے قائل نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے مسلمان نہ ہندو کے غلام رہیں نہ انگریز کے۔ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کے قائل تھے۔ تاکہ مسلمان وہ عظمت رفتہ پھر حاصل کر لیں جس نے انہیں دنیا کا "وہ ہیرو" بنا دیا تھا۔ شروع میں اقبال کی یہ آواز تنہا بھی نا مانوس تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اقبال کے نکرد نظر سے اختلاف رکھنے والے اکابر بھی اپنے سابق موقف سے ہٹنے لگے اور محسوس کرنے لگے۔ کہ ضرورت سے زیادہ کانگرس نوازی مسلمانوں کے لیے مضر ہے۔ اس خوشگوار تبدیلی سے متاثر ہو کر اقبال۔ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں (۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء)

"بزمِ اغیار کی رونق ضرور تھی۔ لیکن اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس اہل خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں۔ جس کو کوئی مسلمان ایک منٹ کے لئے بھی قبول نہیں کر سکتا۔"

اور بالآخر اربابِ خلافت یعنی اعلیٰ برادران بھی "بزمِ اغیار کی رونق" نہ رہے۔

کانگرس سے اٹھ آئے۔ اور ان کے نکلتے ہی کانگرس سونی ہو گئی۔

ہم اٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا؟

(۴)

اسلام کا نظامِ مملکت

اشتراکیت۔ اشتمالیت۔ ملوکیت۔ جمہوریت۔ محدود ملوکیت۔ محدود جمہوریت۔ اور باضابطہ آمریت یہ اصطلاحیں سیاست وطن میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اقبالؔ ان میں سے کسی کے قائل نہیں تھے۔ وہ اسلامی نظامِ حکومت کے قائل تھے۔ لیکن یہ ضرور چاہتے تھے کہ اسلامی حکومت کا جو ڈھانچہ تیار ہو، وہ عہد جدید کی ضروریاتِ انسانی کا پورے طور پر حامل ہو۔ ان کے پاس جذبہ تھا۔ لیکن کتاب وسنت کے اسرار و غوامض پر وہ عبور نہ تھا۔ جو ایک عالم دین ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کو ۱ یکم فروری۔ ۱۹۳۴ء کو لکھتے ہیں

"احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے۔ تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمائیے گا۔ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ فقہا کا مذہب اس کے بارے میں کیا ہے؟۔ قاضی مبارک ہیں شاید اس کے متعلق کوئی فتویٰ ہے۔ وہ فتویٰ کیا ہے؟ اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماع اور معاشرت

سے گہرا تعلق ہے۔ کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد

ہوگی۔ صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں۔ صدقہ اور خیرات میں

کیا فرق ہے؟‘‘

(۳)

کانگریس کا اعلانِ آزادی

”نہرو رپورٹ“ کے نام سے کانگریس نے ایک فتنہ اٹھایا۔ مسلمانوں نے اسے رد کر دیا۔ کانگریس نے مسلمانوں کی نارضامندی کی پرواہ کئے بغیر دریائے راوی کے کنارے (دسمبر ۱۹۲۹ء) آزادی کامل کا اعلان کر کے دم لیا۔ یہی وہ تاریخ ہے جب علی برادران مستقل طور پر کانگریس سے الگ ہوتے ہیں۔ اور مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہو کر کانگریس سے برسرپیکار ہوتے ہیں۔ کانگریس کے اس اعلان پر اقبال مولانا عبدالماجد دریابادی (جنوری ۱۹۳۰ء) کو لکھتے ہیں

”لاہور کانگرس نے آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔ جماعتی اختلافات کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ دیکھئے ہندوؤں کا ”لبرل گروہ“ ان اختلافات کا کیا فیصلہ کرتا ہے؟ مسلمانوں میں آزادی کے لئے ایک ولولہ موجود ہے۔ مگر

مشکل ایں نیست کہ بزم از ہنگامہ گزشت

مشکل اینست کہ بے نقل ونديم اند همه

(۵)

اسلام کیا ہے اور وطنیت کیا چیز ہے؟

کانگرس نے حریت اور آزادی کی جو تحریک چلائی تھی۔ اس کی نظر فریبی سے متاثر ہو کر بہت سے مسلمان نوجوان۔ استقلال وطن کے لئے سر بکف میدان میں اترنے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ اقبال اس جوش رائگاں کو دیکھتے تھے، اور اپنے نوجوانوں کی بے بصیرتی پر افسوس کرتے تھے۔ ایک خط میں (۲۷ فروری ۔ ۲۲ء) وہ اپنے دردِ دل کا اظہار کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے نوجوان طبقہ کی کم نگاہی پر آنسو بہاتے ہیں۔ کہ یہ طبقہ اسلام کا مجاہد بننے کی بجائے وطن کا سپاہی بننے پر تلا ہوا ہے۔ اور اس ذمہ داری کو فراموش کر چکا ہے جو اسلام نے اس پر عائد کی تھی۔ فرماتے ہیں:۔

"آپ نے اپنے پہلے خط میں "وطنیت" کے اصول پر اسلام کے اصول اجتماعی کو ترجیح دینے میں مجھے امام العصر کہا ہے۔ جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ ایک نیشنلسٹ اخبار جس کے چار ایڈیٹر ہیں اور چاروں مسلمان ہیں۔ اور جس کا پہلا نمبر لاہور سے آج ہی نکلا ہے لکھتا ہے کہ اقبال نے "وطنیت" کا غدر لنگ تراشا ہے۔ دیکھا مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے کتنے نومایہ ہیں؟ ان کو معلوم نہیں۔ کہ اسلام کیا ہے؟ اور وطنیت کیا چیز ہے؟ "وطنیت" ان کے نزدیک لفظ وطن کا محض ایک مشتق ہے۔ اور بس"

ذرا اقبال کے ان الفاظ پر پھر غور کیجئے۔ "ان کو معلوم نہیں کہ اسلام کیا ہے اور

وطنیت کیا چیز ہے" پھر یہ بھرپور طنز ان کی کوتاہی فکر پر "وطنیت" ان کے نزدیک وطن کا محض ایک مشتق ہے۔ اور بس"۔!

(۶)

محمد علی کی یاد

اقبال کے ذاتی تعلقات محمد علی سے بے حد خوش گوار تھے۔ وہ ان کے ایثار۔ قربانی للہیت۔ خلوص۔ حب وطن۔ حب قوم۔ جوش کردار۔ بے باکی۔ تہور۔ شجاعت۔ اور جذبۂ ایمانی کے ہمیشہ معترف رہے۔ لیکن ان کی سیاست سے اپنے آپ کو کبھی ہم آہنگ نہ کر سکے۔ زندگی میں اور وفات کے بعد انہوں نے محمد علی کے کردار اور سیرت پر اپنے اشعار کے ذریعے خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ لیکن سیاسی اختلافات ہر دور میں قائم رہے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد وہ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو (یکم فروری ۱۹۳۱ء) لکھتے ہیں :-

> محمد علی مرحوم کا خاتمہ بخیر ہوا۔ اگرچہ میں ان کی سیاست کا کبھی بھی مداح نہ تھا لیکن ان کی اسلامی سادگی اور امانت و دیانت کا بہت احترام کرتا ہوں۔ اپنے متعلق انکی پیشگوئی بھی درست ثابت ہوئی اور اس سے بھی قوم میں ان کا وقار بڑھ گیا۔ مسجد اقصیٰ میں آخری آرام گاہ کا میسر آنا۔ ان کی خوش نصیبی ہے۔ جس سے ان کا مرتبہ بلند تر ہو گیا۔

(۷)

فلسطین۔ یہود اور انگریز

برطانوی پارلیمنٹ کی طرف سے جو رپورٹ مسئلہ فلسطین پر شائع ہوئی تھی اور جو گویا تقسیم فلسطین کا آغاز تھا۔ اس نے نہ صرف ممالک عربیہ میں بلکہ مسلمانان ہند میں ایک ہیجان و اضطراب برپا کر دیا تھا۔ اقبال عام سیاسی ہنگاموں سے الگ رہتے تھے۔ لیکن یہ ایسا مسئلہ نہیں تھا جس سے بے تعلق رہ سکتے۔ چنانچہ لاہور میں جو شاندار احتجاجی جلسہ ہوا۔ اس میں گو وہ اپنی علالت کے باعث شریک نہ ہو سکے۔ لیکن جو پیغام بھیجا اس کا ایک اہم حصہ یہ ہے :۔

"یہ فیصلہ مسلمانانِ عالم کو ایک موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس امر کا اعلان کریں کہ وہ مسئلہ جس کا حل برطانوی سیاست دان تلاش کر رہے ہیں محض قضیۂ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا۔

مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں یہود کا ۱۳ صدیوں پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یروشلم میں داخلے سے قبل خاتمہ ہو چکا تھا۔ فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا۔ بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادہ سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف

کا تمام حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و رون ہوا۔ مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ بالفرض اگر یہ اعتراف بھی کر لیا جائے کہ حروب صلیبیہ فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنانے کی کوشش تھی تو اس کوشش کو صلاح الدین کی فتوحات نے ناکام بنا دیا۔ لہٰذا میں فلسطین کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتا ہوں۔ مشرق قریب کے اسلامی ممالک سے متعلق برطانوی سامراجی ارادے کبھی بھی اس طرح بے نقاب نہ ہوئے تھے۔ جیسے رائل کمیشن کی رپورٹ نے انہیں رسوا کر دیا ہے۔ فلسطین میں یہود کے لئے ایک وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپیریلیزم مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیاست کی شکل میں اپنے ایک مقام کی متلاشی ہے۔ یہ رپورٹ مسلمانان ایشیاء کے لئے بڑی بڑی عبرتوں کی سرمایہ دار ہے۔ تجربہ نے اس امر کو واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت و استحکام عربوں اور ترکوں کے فوری اتحاد مکرر پر موقوف ہے۔ ترکوں کو دنیائے اسلام سے علیحدہ کر دینے کی حکمت عملی ابھی تک جاری ہے۔ کہا جاتا ہے اب بھی یہ صدا بلند ہوتی ہے۔ کہ ترک تارک اسلام ہو رہے ہیں ترکوں پر اس سے بڑا بہتان نہیں باندھا جا سکتا۔ اس شرارت آمیز پراپیگنڈے کا شکار وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو تاریخ تصورات اسلامیہ سے نابلد ہیں۔ فلسطین انگلستان کی کوئی ذاتی جائداد نہیں۔ فلسطین تو انگلستان کے پاس جمعیتہ الاقوام کی طرف سے زیر انتداب ہے۔ اور مسلم ایشیا و لیگ آف نیشنز کو انگریزوں اور فرانسیسیوں

کا ایک ایسا ادارہ سمجھتا ہے جسے انہوں نے کمزور مسلم سلطنتوں کے علاقوں کی تقسیم کے لئے وضع کر رکھا ہے۔ فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق نہیں یہودیوں نے تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے قبضہ سے بہت پہلے خیر باد کہہ دیا تھا۔ صیہونیت بھی کوئی مذہبی تحریک نہیں۔ علاوہ اس امر کے کہ مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خود فلسطین رپورٹ نے اس امر کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔

فلسطین رپورٹ کو منصفانہ نظر سے پڑھنے والے کے دل میں یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ تحریک صیہونیت کا آغاز یہودیوں کے لئے ایک قومی وطن مہیّا کرنے سے کہیں زیادہ برطانوی سامراج کے لئے میڈیٹیرینین (بحر روم) میں ایک ساحلی کنارہ حاصل کرنے کے لئے ہوا تھا۔"

(۸)

جمہوریت کا آغاز؟ خونریزی سے

گول میز کانفرنس (۱۹۳۰-۱۹۳۱ء) کے بعد یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ ہندوستان میں اکثریت کی حکومت جمہوریت کا لبادہ اوڑھ کر قائم ہو جائے گی۔ اور بعد میں انڈیا ایکٹ کے نفاذ کے بعد (۱۹۳۶ء) ہوا بھی یہی۔ اقبال کی بصیرت نے اس خطرناک صورتِ حال کا کئی سال پہلے اندازہ کر لیا تھا۔ مکتوب ذیل (۲۳ مئی ۱۹۳۲ء) کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

"بمبئی کے فسادات نے جو ابھی تک فرو نہیں ہوئے ہیں، بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز ایک خونریزی

کی صورت اختیار کرے گا۔ اور یہ بدامنی ایسے نتائج پیدا کرے گی جو بے حد ناگوار ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہترین برطانوی واقف کار کو بھی اس امر کا قطعاً اندازہ نہیں کہ اس بظاہر پرسکون سمندر کی گہرائی میں کیسے کیسے، طوفان بے تاب ہیں۔؟"

اور کون کہہ سکتا ہے کہ اقبال کی یہ پیش گوئی غلط ثابت ہوئی؟ کون نہیں جانتا ان طوفانوں نے جو پرسکون سمندر کی تہ میں خاموش تھے، نمودار ہو کر کیسی کیسی قیامتیں برپا کیں۔ کس کس طرح انسانیت کا خون کیا؟ کس بے دردی سے انسانیت کو ذبح کیا؟ کس سنگ دلی اور شقاوت کا بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی جان اور آبرو لے کر ثبوت دیا۔

(۹)

ایک پیشین گوئی

ہندو مسلم اختلافات کی تہ میں جو چیز کارفرما تھی وہ اکثریت کی ہٹ دھرمی، تعصب خود غرضی اور خوئے شقاوت تھی۔ جو اکثر فسادات کی صورت میں ظاہر ہوا کرتی تھی۔ اقبال نے اس بات کو شروع ہی میں محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیراعظم سلطنت آصفیہ۔ حیدرآباد کو ایک مکتوب (۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء) میں لکھتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمان کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آیندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔"

اور یہ پیش گوئی واقعی ۱۵ سال کے اندر بڑے ہولناک طور پر پوری ہوئی۔!

(۱۰)

قائدِ اعظمؒ کے نام

قائدِ اعظم نے جب مسلم لیگ کی اور بعد میں مسلمانانِ ہند کی عنانِ قیادت اپنے ہاتھ میں لی تو سب سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اقبال نے ان کی تائید کی۔ پنجاب اس وقت سرکار پرستوں کا مرکز تھا۔ لیکن اقبال نے حق کی آواز بلند کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ پنجاب میں یونینسٹ راج تھا۔ اس راج کے خلاف وہ برابر اعلائے کلمۃ الحق کرتے رہے۔ وہ بیمار تھے۔ صاحب فراش تھے لیکن مسلم لیگ کے احیاء اور مسلمانوں کی سیاسی نشاۃ ثانیہ کے لئے وہ اس معذوری کے باوجود یکسر حرکت اور عمل بنے ہوئے تھے۔

قائدِ اعظم کو اپنے ایک مکتوب (مورخہ ۶ جون ۱۹۳۶ء) میں تحریر فرماتے ہیں :-

"میرا تیار کیا ہوا مسودہ ارسالِ خدمت ہے۔ (آپ کے) بیان میں لگی لپٹی رکھے بغیر ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ حیثیت کا ہندوؤں اور حکومت دونوں سے متعلق ایک واضح اور صاف صاف اعلان ہونا چاہیے۔ اس بیان میں یہ انتباہ بھی موجود ہونا چاہیے کہ اگر مسلمانانِ ہند نے موجودہ اسکیم کو اختیار نہ کیا تو نہ صرف جو کچھ گذشتہ پندرہ برس میں حاصل کر چکے ہیں اسے بھی کھو دیں گے بلکہ اپنا شیرازہ خود اپنے ہاتھوں

درہم برہم کرکے اپنے لئے خسارے کا باعث ہوں گے۔"

(۱۱)

کچھ جواہر لال کے بارے میں

پنڈت جواہر لال نہرو ایک عرصۂ دراز تک مسلمانان ہند کے محبوب اور ہردلعزیز رہنما رہے۔ ان کی بے تعصبی۔ رواداری۔ مسلم دوستی، وسعت قلب وظرف کا مسلمانوں پر بہت اثر تھا۔ مسلمانوں کے جس اجتماع میں وہ پہنچ جاتے تھے۔ سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے تھے۔ دیدہ ودل ان کے لئے فرش راہ کئے جاتے تھے۔ مسلمانوں کو ہندوؤں سے کتنی ہی شکائتیں ہوں۔ لیکن جواہر لال سے شکایت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مہاسبھا کے طرز عمل سے کتنا ہی غم وغصہ ہو لیکن جواہر لال کا طرز عمل ایک محبوب کا طرز عمل تھا۔ کانگرس کی روش کتنی ہی مایوس کن ہو لیکن جواہر لال کی روش ایک ممدوح ایک ہیرو، ایک قائد کی روش تھی۔ اس پر اعتراض واپراد کی گنجائش کہاں تھی؟ کانگرسی راہنماؤں —— موتی لال نہرو۔ لاجپت رائے۔ حتیٰ کہ گاندھی جی تک —— سے کتنا ہی گلہ ہو۔ لیکن کیا جواہر لال سے بھی گلہ ہو سکتا تھا؟ —— جواہر لال دل کی خواہش آنکھوں کی آرزو ہے؟ ناممکن قطعاً ناممکن۔

یہ مسلمان ہی تو تھے جنہوں نے اس کی قیادت کو اچھالا تھا۔ جنہوں نے ہر نازک مرحلہ پر رہنمائی کی امید اس سے باندھی تھی۔ لیکن وہ جواہر لال نہرو ہی تھا۔ جس نے فرقہ وارانہ سوال کے وجود سے انکار کیا تھا۔ جس نے مسلمانان ہند کی جداگانہ حیثیت قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ جس نے ناگپور کے ہندی ساہتیہ پریشید کے کھلے اجلاس

میں (۱۹۳۶) اردو کے مقابلہ ہندی کو قومی اور سرکاری زبان بنانے کی حمایت کی تھی۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمدؐ مجیب جیسے گاندھی جی کے اور کانگرس کے بے لوث نیاز مندوں کے احتجاجی مکتوب کے پیش نظر ان کی "ناسمجھی" پر اظہار حیرت کیا تھا۔ جس نے کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں بہ الفاظ واضح اعلان کیا تھا۔ "اس ملک میں دو طاقتیں ہیں۔ کانگرس اور انگریز"۔ اور جب قائد اعظم نے جواب دیا "ایک تیسری قوت بھی ہے"۔ "ملت اسلامیہ!" ؟ تو سنی اَن سنی کر دی تھی۔ جس کے عہد اور جس کی زیر نگرانی (۱۹۳۶) صوبوں کے اندر کانگرس وزارتیں بنیں اور ان وزارتوں نے عام طور پر اور سی۔پی۔ کی کانگرسی وزارت نے خاص طور پر مسلمانوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر مسلمانوں کا دل پارہ پارہ ہو گیا کہ اس جواہر لال نے کبھی ان کے زخم پر مرہم نہ رکھا۔ کبھی ان کے نالہ و شیون پر توجہ نہ کی۔ کبھی ان کی فریاد نہ سنی اور داد کو نہ پہنچا۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں میرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

خود اقبال بھی جواہر لال کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے تھے کشمیریت کے اشتراک سے قطع نظر وہ جواہر لال کے اخلاص۔ بے باکی۔ جوش کار۔ حب وطن ذہانت۔ قابلیت۔ فراست ہر چیز کے معترف تھے۔ لیکن یہ تماشہ دیکھ کر ان کی غیرت بھی خاموش نہ رہ سکی۔ اور وہ "جواب آں غزل" پر مجبور ہو گئے۔ خود بیمار تھے۔ لیکن قائد اعظم کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مکتوب۔

(مورخہ ۲۰ مارچ۔ ۱۹۳۷ء)

"بصیغۂ راز"

مائی ڈیر مسٹر جناح ۔

"امید ہے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ جو انہوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے اجلاس میں فرمایا ہے آپ کے ملاحظہ سے گزرا ہو گا ۔ اور ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق اس خطبہ میں جو مسلک کارفرما ہے اس پر آپ نے پورے طور پر غور کیا ہو گا میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس امر کا بخوبی اندازہ ہے کہ ہندوستان کی آئندہ سیاسی ترقیات کے پیش نظر دستور جدید ہندی مسلمانوں کو اپنی تنظیم کے لئے ایک نادر موقع بہم پہنچاتا ہے ۔

اگرچہ ہم ملک میں تمام ترقی پسند پارٹیوں کے ساتھ موالات کے لئے تیار ہیں ۔ تاہم ہمیں اس حقیقت کو ہرگز پس پشت نہ ڈالنا چاہیئے ۔ کہ ایشیا میں اسلام کے اخلاقی و سیاسی اقتدار کا دارومدار تمام تر ہندوستانی مسلمانوں کی مکمل تنظیم پر ہے ۔ لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو ایک پرزور جواب دیا جائے آپ کو چاہیے کہ دہلی میں جلد از جلد ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں ۔ جس میں نئی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے علاوہ دوسرے متقدر مسلم راہنماؤں کو بھی دعوت شمولیت دی جائے ۔ آپ کو چاہیے کہ اس اسلامی موتمر کی طرف سے پوری قوت اور قطعی وضاحت کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی وحدت کا بطور نصب العین اعلان کر دیں ۔ یہ امر لابدی ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دنیا کو صاف بتا دیا جائے ۔

کہ ہندوستان میں حل طلب مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں۔ بلکہ ہندی مسلمانوں کی اکثریت کی نگاہ میں تہذیب اسلامی کا مستقبل اگر معاشی مسئلے سے زیادہ اہم نہیں تو اس سے کسی طرح کم اہمیت کا حامل بھی نہیں۔

اگر آپ ایسی کنونشن منعقد کر سکیں تو ان مسلم اسکان مجالس واضع قوانین کی حیثیت کا پول بھی کھل جائے گا۔ جنھوں نے مسلمانوں کی خواہشوں اور تمناؤں کے خلاف اپنی اپنی جداگانہ پارٹیاں قائم کر لی ہیں۔ مزید برآں اس کنونشن سے ہندوؤں پر بھی یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی تدبیر خواہ وہ کس قدر بھی عیارانہ کیوں نہ ہو ہندی مسلمانوں کو اپنی ثقافتی وحدت سے غافل نہیں کر سکتی۔ میں چند روز تک دہلی آ رہا ہوں اور اس اہم مسئلہ پر آپ سے گفتگو کروں گا۔ تحریر مابعد۔

معاف فرمائیے ضعف بصارت کی وجہ سے یہ خط میں نے ایک دوست سے لکھوایا ہے۔"

(۱۲)

مسلمانوں کی ملّی انفرادیّت

اقبال خود بیمار ہیں۔ معذور ہیں۔ جہد وعمل سے مجبور ہیں۔ لیکن دماغ برابر کام کر رہا ہے اور اس کی قوت صرف اس امر پر صرف ہو رہی ہے کہ مسلمانانِ ہند ہندو استیلاء سے نجات پائیں۔ اپنی قومی انفرادیت قائم رکھیں۔ انگریز کی غلامی سے نکل کر ہندو کے غلام نہ بن جائیں۔ کانگریس کے دام ہم رنگ زمین کا شکار نہ ہونے پائیں۔ نظریں بار بار

قائداعظم پر جاکر جم جاتی ہیں ۔ اقبال کی نظر میں وہی ایک ایسا مسیحا ہے۔ جو قوم کے تن مردہ میں جان ڈال سکتا ہے ۔ اس میں عزم و ہمت کی روح پیدا کر سکتا ہے ۔ تمام راہنماؤں سے مایوس ہو کر مسٹر جناح کو وہ کعبۂ آرزو بناتے ہیں۔ تمام سیاسی اداروں سے بددل ہو کر مسٹر جناح کی مسلم لیگ کو وہ فعال و کارگزار عوامی ادارہ بنا دینا چاہتے ہیں ۔ اس سلسلہ میں وہ قائداعظم کے سامنے چند تجویزیں رکھتے ہیں ۔ جنہیں روبہ عمل لانے کے بعد مسلم لیگ عوامی جماعت بن سکتی ہے ۔ مسلمان کانگریس کے فریب سے آزاد ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی ملّی انفرادیت ہر قسم کے گزند سے محفوظ رہ سکتی ہے ۔ چنانچہ مکتوب ذیل ملاحظہ ہو :۔

لاہور ۔

۲۸ - مئی - ۳۷ء

بصیغۂ راز

مائی ڈیر مسٹر جناح

"نوازش نامہ موصول ہوا ۔ جس کے لئے سراپا سپاس ہوں ۔ یہ اطلاع کہ لیگ کے دستور و پروگرام میں جن تغیرات کی طرف میں نے آپ کی توجہ مبذول کرائی تھی وہ آپ کے پیش نظر رہیں گے ۔ موجب مسرت و اطمینان ہوئی ۔

مجھے کامل یقین ہے کہ اسلامی ہند کی نزاکت حالات کا آپ کو پورا پورا احساس ہے ۔ لیگ کو انجام کار یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا ۔ کہ وہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندہ بنی رہے یا مسلمان عوام کی نمائندگی کا حق

ادا کرے؟ جنہیں اب تک نہایت بجا طور پر لیگ میں کوئی وجہ دل کشی نظر نہیں آئی۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی سیاسی جماعت جو عام مسلمانوں کی بہبودی کی ضامن نہ ہو۔ عوام کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔

نئے دستور کے ماتحت بڑی بڑی آسانیاں تو اعلیٰ طبقات کے لوگوں کے لئے وقف ہیں اور چھوٹی چھوٹی وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دوسرے اعتبار سے بھی ہمارے سیاسی اداروں نے غریب مسلمانوں کی اصلاح حال کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے۔"

اتنا کچھ کہہ سکنے کے بعد بھی ان کا دل مطمئن نہیں ہوتا۔ اپنا مدعا دل نشین پیرایہ میں وہ قائداعظم کے گوش گزار کر چکے ہیں۔ لیکن کچھ اور باتیں ہیں جو ان کے ذہن و دماغ میں ہلچل پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اس طرف بھی وہ قائداعظم کو متوجہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"جواہر لال کی سیکولر خدا اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو افلاس سے کیونکر نجات دلائی جا سکتی ہے۔؟

لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے؟ اگر لیگ کی طرف سے

مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوشش نہ کی گئی، تو مسلمان عوام پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے

خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے۔ اور فقہ اسلامی کا مطالعہ مقتضیات حاضرہ کے پیش نظر دوسرے مسائل کا حل بھی پیش کر سکتا ہے!"

(۱۳)

مسلمانوں کے افلاس کا حل "اسلامی دستور"!

اپنے اس گرامی نامہ میں اقبال نے آگے چل کر بہت زیادہ خوبی اور وضاحت کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اور صاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس، ہندوستان کے امن اور تمام مسائل کا حل صرف اسلام ہی سے ہو سکتا ہے

"شریعت اسلامی کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ ایک مصیبت تو یہ ہے کہ ایک آزاد اسلامی ریاست کی عدم موجودگی میں شریعت اسلامی کا نفاذ اس ملک میں محال ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور میں اب بھی اسے مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔ اگر ہندوستان میں اس طریق کار پر عمل درآمد اور اس عقیدہ کا حصول ناممکن ہے۔ تو پھر صرف ایک ہی راہ رہ

جاتی ہے۔ اور وہ خانہ جنگی ہے۔ جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کئی سالوں سے شروع ہے۔

مجھے قوی اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کی سی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ جواہر لعل کی اشتراکیت محض ہندوؤں میں کشت و خون کا موجب ہوگی

معاشرتی جمہوریت اور برہمنیت کے درمیان وجۂ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے درمیان وجۂ نزاع۔ سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہندوستان میں بدھ مت کا سا ہوگا۔ یا نہیں میں اس سے متعلق تو کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ لیکن مجھے اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ ہندو دھرم معاشرتی جمہوریت (سوشل ڈیماکریسی) اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم کا خاتمہ ہے۔"

(۱۴)

ملک کی تقسیم یعنی پاکستان کا مطالبہ

اپنے اس طویل اور نہایت معرکہ آرا خط میں اقبال نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو ان کے دل میں تھا۔ وہ واضح اور دو ٹوک الفاظ میں قائداعظم سے کہتے ہیں کہ ہمارے مرض کا مداوا صرف تقسیم ہند ہی ہے۔

"اسلام کے لئے سوشل ڈیماکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی

انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ مسائل حاضرہ کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔
لیکن جیسا اوپر ذکر کر چکا ہوں اسلامی ہندوستان میں ان مسائل کا حل بآسانی رائج کرنے کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آپہنچا؟ شاید جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ بہترین جواب ہے۔

بہرحال میں نے اپنے خیالات آپ کی خدمت میں اس امید پر پیش کر دیئے ہیں کہ آپ ان پر اپنے خطبہ یا لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں پوری پوری توجہ مبذول کر سکیں۔
اسلامی ہندوستان کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فطانت و فراست ہماری موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔"

(۱۵)

خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے

یہ بڑا نازک اور فیصلہ کن وقت ہے۔ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ غلامی کے بندھن کٹ رہے ہیں۔ آزادی کی صبح امید طلوع ہوا چاہتی ہے۔ انگریز رخت سفر باندھ رہے ہیں۔ ہندو اکثریت اپنے سامراجی مقاصد کے ساتھ میدان میں نمودار ہو رہی ہے۔ مسلمان اقلیت پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ اقبال مسٹر جناح کے

دروازے پر دستک دیتے ہیں :۔

لاہور۔

۲۱۔جون۔۱۹۳۷ء

بصیغہ راز۔

مائی ڈیر مسٹر جناح

نوازش نامہ کل موصول ہوا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ کی بے پناہ مصروفیت سے آگاہی رکھنے کے باوجود آپ کو اکثر خط لکھتے رہنے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس وقت مسلمانوں کو اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید ملک کے گوشے گوشے سے اٹھنے والا ہے۔ صرف آپ کی ذات گرامی ہی سے رہنمائی کی توقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں ہم فی الحقیقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ فوج اور پولیس موجود نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن میں عالم گیر ہو جائے گزشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو چکا ہے صرف شمال مغربی ہندوستان کے اندر اس تین ماہ کی مدت میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول کی کم از کم چار واردات پیش آچکی ہیں۔ توہین رسول اللہ کی ان چاروں وارداتوں میں مجرم فی النار کر دیا گیا۔ سندھ میں قرآن کریم کے نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے۔ صورت حال کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ ان حالات کے اسباب

نہ مذہبی ہیں نہ معاشی بلکہ خالص سیاسی ہیں"۔

(۱۶)

ہندو اور مسلم صوبے

اپنے اس خط میں اقبال انڈیا ایکٹ کے ماتحت نافذ ہونے والے دستور کی خامیوں اور مضرتوں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دستور نہ ہمارے مسائل کا حل ہے۔ نہ ہماری توقعات کا حامل۔ یہ صرف ہندوؤں کے لیے انگریزوں کی طرف سے ایک تحفہ ہے:۔

"مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے۔ آئین کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دارومدار تمام تر غیر مسلموں پر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ صرف کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتی بلکہ وزارت کو خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنی پڑتی ہے۔ تاکہ وہ لوگ جن کی امداد پر وزارت قائم ہے۔ خوش رہ سکیں۔ اور ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر منعصب ہے لہٰذا یہ عالم آشکار حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے پاس اس آئین کو رد کرنے کے خاص وجوہ موجود ہیں مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ دستور جدید ہندوؤں ہی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے"۔

ان صوبوں میں جہاں ہندو آبادی کی اکثریت ہے۔ حکومت میں ہندوؤں

کو قطعی اکثریت حاصل ہے۔ اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دست نگر رکھا گیا ہے مجھے اس امر میں قطعاً ذرہ برابر شک وشبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ موجودہ دستور ہندی مسلمانوں کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ مزید برآں یہ دستور تو اس معاشی تنگدستی کا جو شدید ترین ہوتی چلی جارہی ہے کوئی حل پیش نہیں کرتا فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے۔ لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف جو اس کی معاشی پسماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو۔ اور نہ کر سکے اس کے لئے بے سود ہے۔"

(۱۷)

مسلم صوبوں کا جداگانہ وفاق

صورتِ حالات کو واضح کر چکنے کے بعد اقبال نہایت احتیاط لیکن وضاحت کے ساتھ قائداعظم کے سامنے آخری اور واحد چارہ کار پیش کرتے ہیں۔ اس مکتوب میں وہ کانگرس کے صدر جواہر لال کی روش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"کانگرس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری جماعت یعنی ہندو مہاسبھا نے جسے میں ہندو عوام کا حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا وجود ہندوستان میں ناقابل قبول ہے۔۔

ہندوستان میں قیام امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچانے کی واحد ترکیب اس طریقہ پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے یعنی مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق میں اصلاحات کا نفاذ ہے شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو ہند اور بیرون ہند کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری سے کیونکر محروم کیا جا سکتا ہے۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت و مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی وقت اس طریق سے وابستہ ہے۔ لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبہ میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور لیگ کے آئندہ اجلاس کا لاہور میں انعقاد پنجابی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لئے از حد مفید ہوگا۔"

(۱۸)

کمیونل ایوارڈ

گول میز کانفرنس میں جب ہندو مسلم مفاہمت نہ ہو سکی تو ہندوؤں (مہا سبھائی اور کانگرسی ـــــ مالوی اور گاندھی) کی درخواست پر یہ مسئلہ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق جو چاہیں فیصلہ کر دیں ہم

قبول کر لیں گے۔ مسلمانوں نے نہ اس طرح کا کوئی وعدہ کیا نہ وزیر اعظم سے ایوارڈ کی درخواست
ہندوؤں کی یہ روش اس امید پر مبنی تھی کہ وہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو اپنا خاص آدمی
سمجھتے تھے۔ اور وہ تھے بھی ہندوؤں سے بہت قریب چنانچہ مولانا محمد علی مرحوم نے تو
ان کا نام ہی ریمزے میکڈانلڈ کے بجائے "راجی مکنداال" رکھ دیا تھا۔ لیکن ایوارڈ دیتے
وقت مسٹر میکڈانلڈ حقائق سے اپنی آنکھیں نہ بند کر سکے۔ اس ایوارڈ کی رو سے مسلم صوبوں
میں مسلمانوں کی اکثریت کسی حد تک محفوظ ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے تو اسے
مان لیا۔ لیکن ہندو اسے مسترد کر دینے پر تل گئے۔ مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی
کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے اس کے خلاف دھواں دھار تقریر کی اور اسے
ناقابل قبول قرار دیا۔ مسٹر جناح نے اپنی تقریر میں فرمایا۔ ہم اس ایوارڈ کو مسترد کرنے
پر تیار ہیں۔ لیکن آؤ پہلے ہم تم کوئی مفاہمت کر لیں۔ کانگرس اس پر تیار نہ ہوئی۔
ایوارڈ نافذ رہا۔ اب کانگرس نے دوسری ترکیب یہ کی کہ چند قوم فروش مسلمانوں کی
مدد سے اسے مسترد کرنا چاہا۔ اسی زمانہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں (۲۷)
منعقد ہو رہا تھا۔ جو ہر اعتبار سے بڑا اہم اور فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اقبال قائداعظم
کو لکھتے ہیں :۔

لاہور۔

۷۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء

(بہ صیغہ راز)

مائی ڈیر مسٹر جناح

امید ہے پنجاب سے خاصی تعداد لکھنؤ کے اجلاس میں شرکت کے

لئے پہنچے گی۔ یونینسٹ مسلمان بھی سرسکندر کی قیادت میں شمولیت کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان آپ سے متوقع ہیں کہ اس پرآشوب زمانہ میں آپ ان کے مستقبل سے متعلق ان کی کامل اور واضح راہ نمائی فرمائیں گے۔ میری تجویز ہے کہ لیگ کمیونل ایوارڈ (COMMUNAL-AWARD) سے متعلق اپنی پالیسی ایک مناسب قرارداد کی صورت میں واضح کر دے۔ خود پنجاب اور معلوم ہوا ہے کہ سندھ میں بھی بعض گمراہ مسلمان اس فیصلہ کو اس طرح بدل دینے کے لئے تیار ہیں۔ کہ یہ ہندوؤں کے حق میں زیادہ مفید ہو جائے۔ ایسے لوگ بخوشی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کر لینے کے بعد وہ اپنا موجودہ اثر و اقتدار بحال رکھ سکیں گے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ انگریز ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے برطانوی حکومت اپنے مسلمان ایجنٹوں کے کندھوں پر ہی اس کا جنازہ اٹھوانا چاہتی ہے۔"

خط خاصا طویل ہے۔ ہم نے صرف وہی حصہ درج کیا ہے جو ہمارے عنوان سے متعلق ہے۔ اس خط کے آخر میں اقبال قائداعظم کو ایک اور بڑی اہم صلاح دیتے ہیں۔ تحریر مابعد۔

"لیگ کو اس امر کی قرارداد پاس کرنی چاہیے۔ کہ کوئی صوبہ دوسری اقوام کے ساتھ کمیونل ایوارڈ سے متعلق کوئی سمجھوتہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا چونکہ اس مسئلہ کا تعلق تمام ہندوستان سے ہے۔ لہٰذا اسے طے کرنے کا حق صرف لیگ ہی کو حاصل ہوگا۔ شاید ایک قدم آگے۔ بڑھا کر آپ

کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ فضا کسی فرقہ وارانہ مصالحت کے لئے سازگار نہیں۔"

(۱۹)

جیل جانے پر آمادگی

سب جانتے ہیں اقبال بڑے عافیت پسند تھے خود انہیں بھی اس کا اعتراف تھا لیکن اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہ اپنی عافیت پسندی کے باوجود جیل جانے کو بھی تیار تھے۔ ہندوستان کے مسلمان جن نازک اور ناقابل برداشت حالات سے دوچار تھے ان پر تو اقبال کا دل تڑپ ہی رہا تھا۔ لیکن عالم اسلام جس دور سے گذر رہا تھا۔ اور خاص طور پر فلسطین جس طرح برطانوی راج کا شکار بنا ہوا تھا۔ اس سے بھی وہ کچھ کم متاثر نہیں تھے۔ چنانچہ مسٹر جناح کے نام ایک مکتوب میں جیل جانے پر بھی آمادہ نظر آتے ہیں۔

پھر جب مسلمان جوق در جوق لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے لگے تو یہ رنگ دیکھ کر کانگرس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں بیس پوت سے کام لے کر آرزوئے مفاہمت کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کے جائز مطالبات ماننے پر اظہار رضامندی کیا تھا۔ اقبال اس فریب میں نہ آسکے۔ قائداعظم کو لکھتے ہیں۔ (مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۳۷ء)

"امید ہے آل انڈیا کانگرس کی قرارداد آپ کے ملاحظے سے گزری ہوگی۔ ہم سب کانگرس کی قرارداد پر آپ کے خیالات کے منتظر ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اس کا اثر خواب آور نہ ہونا چاہیئے۔ ہمیں مسلمانوں کی تنظیم کے لئے اپنی تمام قوتیں ہمیشہ سے زیادہ گرم جوشی

کے ساتھ وقف کر دینی چاہییں۔ اور اس وقت تک دم نہ لینا چاہیئے۔ جب تک پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہو جاتی اور بلوچستان کو اصلاحات نہیں ملتیں۔

یہاں افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ مسلم لیگ کے مسلک پر دستخط کرنے کو تیار نہیں۔ ابھی تک سر سکندر اور ان کی پارٹی نے دستخط نہیں کئے۔ اور آج صبح معلوم ہوا کہ وہ لیگ کے آئندہ اجلاس تک انتظار کریں گے۔ جیسا کہ خود ان کے ایک ساتھی نے کہا۔ ان کا منشاء صوبائی لیگ کی قوتِ عمل کو معطل کر دینا ہے۔"

(۲۰)

عطیہ بیگم کے نام ایک خط

اب یہ باب ختم ہوتا ہے۔ لیکن اسے ختم کرنے سے پہلے عطیہ بیگم فیضی کے نام اقبال کا ایک خط تقسیم بنگال کی تنسیخ سے متعلق درج کرتے ہیں۔ جو پر لطف بھی ہے اور اقبال کی سیاست دانی کا ثبوت بھی۔ ہندوؤں نے بم بازی کر کے تقسیم بنگال کا فیصلہ (غالباً ۱۹۱۱ء) منسوخ کرا دیا۔ لیکن کلکتہ کو دارالسلطنت ہونے کی جو عظمت حاصل تھی وہ گنوا بیٹھے۔ خط یہ ہے۔

"ہندوؤں نے بنگال کے دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو بنگالی قومیت کے قلب پر ایک ضرب کاری سے تعبیر کیا لیکن حکومت نے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی پوری

ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دیا ہے۔ بنگال سمجھتا ہے کہ جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا۔ کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔ اس مسئلہ سے متعلق دو شعر ہو گئے ہیں۔

مندمل زخم دل بنگال آخر ہو گیا!
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتہ سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو دھوتی اور پگڑی چھن گئی

کشمیر

آدم کہ ضمیرِ او نقشِ دو جہاں ریزد
با لذّتِ آہے ہست بے لذّتِ آہے نیست
ہر چند کہ عشقِ او، آوارۂ راہے کرد
داغے کہ جگر سوزد در سینۂ ماہے نیست

(۵)
کشمیر

کشمیر سے اقبال کو صرف وطنی لگاؤ نہ تھا بلکہ ایک قسم کا روحانی لگاؤ بھی تھا۔ کشمیری مسلمانوں کے نازدزبوں حالات سے وہ بہت متاثر تھے۔ یہ دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو رونے لگتا تھا کہ جنت نظیر کشمیر کے باشندے غلامی کی بیڑیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ہندو سامراج نے نشاط کار اور نشاط قلب کی دولت اُن سے چھین لی ہے۔ وہ زندہ ہیں لیکن مردے سے بدتر۔ وہ اپنے ملک کی اقلیت کے محکوم ہیں۔ ڈوگرہ راج نے ان کی صلاحیتوں کو پامال کر دیا ہے۔ ان سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا ہے۔ انھیں جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔

اقبال نے اپنے خطوں میں، تقریروں میں، خطبوں میں، بیانوں میں، شعروں میں کشمیر کا مرثیہ کہا ہے خود روئے ہیں اور دوسروں کو رُلایا ہے۔ وہ ہر اس تحریک کے ہمدرد تھے جو کشمیر کی صلاح و فلاح کی علم بردار ہو۔ وہ ہر اس جماعت کے رفیق تھے جو کشمیر کا مسئلہ لے کر اٹھے۔ انھیں ہر اس تجویز سے ہمدردی تھی جو اہل کشمیر سے کسی نہج سے بھی متعلق ہو۔ اس مسئلہ پر انھوں نے جو کچھ کہا یا لکھا اس پر نسبتاً تفصیلی گفتگو کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصّہ میں ہوگی۔ لیکن مختصر طور پر مکاتیب کی روشنی

میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آسکتا ہے اور فی الحال ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱)

تذکرۂ شعرائے کشمیر

خط پر سنہ درج نہیں ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ مکتوب اقبال کے عنفوان شباب کا ہے جب وہ صرف بیرسٹر تھے اور شعر و شاعری سے کچھ شغل رکھتے تھے۔

"مجھے یہ معلوم کر کے کمال مسرت ہوئی کہ آپ تذکرۂ شعرائے کشمیر لکھنے والے ہیں۔ میں کئی سالوں سے اس کے لکھنے کی تحریک کر رہا ہوں مگر افسوس کسی نے توجہ نہ کی آپ کے ارادوں میں اللہ تعالیٰ برکت دے۔

افسوس ہے کہ کشمیر کا لٹریچر تباہ ہو گیا۔ اس تباہی کا باعث زیادہ تر سکھوں کی حکومت اور موجودہ حکومت کی لاپروائی اور نیز مسلمانوں کی غفلت ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وادیٔ کشمیر کے تعلیم یافتہ مسلمان اب بھی موجودہ لٹریچر کی حفاظت کے لئے ایک سوسائٹی بنالیں۔ ہاں تذکرۂ کشمیر لکھتے وقت مولانا شبلی کی شعر العجم آپ کے پیش نظر رہنا چاہیئے محض حروف تہجی کی ترتیب سے شعراء کا حال لکھ دینا کافی نہ ہوگا۔ کام کی چیز یہ ہے کہ آپ کشمیر میں فارسی شعرا کی تاریخ لکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسی تصنیف نہایت بارآور ثابت ہوگی۔ اگر کبھی خود کشمیر یونیورسٹی بن گئی تو فارسی زبان کے نصاب میں اس کورس کا ہونا یقینی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ

کشمیر کی قسمت عنقریب پلٹا کھانے والی ہے۔"

(۲)

شیخ عبداللہ کے نام

شیخ عبداللہ نے نیشنل کانفرنس کی بنا بعد میں ڈالی پہلے وہ مسلم کانفرنس کے روح رواں تھے اور مسلمانوں کے لئے بر سر پیکار۔ یہ بات بعد کی ہے کہ وہ کانگرس کے اثر میں آئے اور کانگرس نے، نیز ان کے یار وفادار پنڈت جواہر لال نہرو نے....

(وہ دشمن ہمارا وہ پیارا تمہارا)

ان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی صدائیں تو اب مجلس اقوام متحدہ کے پردوں سے بھی ٹکرا رہی ہیں۔

شیخ صاحب نے اقبال کو مسلم کانفرنس کے اجتماع میں شرکت کی دعوت دی اقبال کسی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ معذرتی خط لکھتے ہیں۔ لیکن اس معذرت میں بھی نصیحت موجود ہے۔ (مورخہ ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء)

"آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے مسلم کانفرنس کے اخبار پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ بزرگان کشمیر بہت جلد اپنے معاملات سلجھا سکیں گے۔ آپ کی کامیابی کے لئے میں ہر لحظہ دست بدعا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے آپ کی مساعی کو بارآور کرے گا۔ لیکن اختلاف آپ کے مقاصد کی تکمیل میں بڑی رکاوٹ ہوگا۔ ہم آہنگی ہی ایک ایسی چیز ہے جو تمام سیاسی و تمدنی مشکلات کا علاج ہے۔ ہندی مسلمانوں کے کام

اب تک محض اس وجہ سے بگڑ رہے ہیں کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی - اور اس کے افراد اور بالخصوص علماء و اوروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے رہے بلکہ اس وقت بھی ہیں - بہرحال دعا ہے کہ آپ کے ملک کو یہ تجربہ نہ ہو۔"

(۴۳) کشمیر کے بے بس مسلمان

کشمیر کے مسلمانوں میں حرکت اور زندگی کے آثار پیدا ہوئے - انھوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا جیسا کہ ہر سامراجی حکومت اپنے محکوموں کے ساتھ کرتی ہے ڈوگرہ راج بھی تعزیر و انتقام پر اُتر آیا اس نے حریت طلبی کے جرم میں مسلمانانِ کشمیر پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ قید و بند اور دار و رسن کی کہانی دہرائی جانے لگی مسلمانوں کے پاس نہ روپیہ تھا نہ وسائل و ذرائع - وہ چکی کے دو پاٹوں میں پیسے جانے لگے پٹنہ کے ایک وکیل نعیم الحق صاحب ان مظلوم مسلمانوں کے مقدمہ کی مفت پیروی کے لئے تیار ہو گئے - اقبال دل کی گہرائی سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انھیں آمادہ کرتے ہیں کہ پٹنہ کے مخیر اور صاحب دل رئیس سید عبدالعزیز سے مسلمانان کشمیر کی امداد کی التجا کریں

(مورخہ ۲۵ دسمبر - ۱۹۳۳ء)

"۵ سے ۱۰ فروری تک مقدمہ سکھ چین پور - ۱۴ سے ۱۷ فروری تک مقدمہ علی بیگ - دونوں مقدمات کی سماعت جموں میں ہو گی - کیا آپ دونوں مقدمات کی پیروی کے لئے تیار ہیں - ملک برکت (علی) فروری میں اپنے انتخاب میں مصروف ہوں گے - ہم سب آپ کی مکرر اعانت

کے لئے نہایت احسان مند ہوں گے۔ اگر آپ تکلیف گوارا فرمائیں۔ تو مجھے فوراً بذریعہ تار اپنی آمادگی سے مطلع فرمائیں۔ تاکہ ضروری کاغذات بھیج سکوں کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے ایک مددگار مہیا کیا جائے۔ عبدالحمید صاحب نے مجھے اطلاع دی ہے کہ آپ نے ذکر کیا تھا کہ پٹنہ کے عبدالعزیز صاحب مسلمانوں کی امداد کو ہر وقت تیار ہوں گے۔ آپ میری طرف سے ان کی خدمت میں کشمیر کے بے بس مسلمانوں کی امداد کی درخواست کیجئے۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے گا۔ آپ کے تار کا انتظار رہے گا۔"

(۴)

کشمیری مسلمانوں کے مقدمات

ایک دوسرے خط میں کشمیر کے بے مایہ اور بے سہارا مسلمانوں کی دست گیری اور داد رسی کے لئے نعیم الحق صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اور مزید تفصیل سے انھیں مطلع کرتے ہیں۔

"آپ کی اس عنایت کا شکریہ کیونکر ادا کیا جائے کہ آپ دونوں مقدمات کی پیروی کے لئے آمادہ ہیں۔ میں اس مقدمہ کا فیصلہ اور دوسرے کاغذات بھیج رہا ہوں۔ جس کی تاریخ پیشی جموں میں ۱۴۔ فروری مقرر ہوئی ہے۔ یہ بہتر ہوگا کہ ۱۲۔ فروری کو جموں پہنچ جائیں۔

دوسرے مقدمہ کے متعلق کاغذات ابھی مجھے موصول نہیں ہوئے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا انتظام ممکن نہ ہوا تو کاغذات موصول ہوتے ہی آپ

کی خدمت میں بھیج دوں گا۔ دوسرا مقدمہ ۵۔ فروری کو شروع ہوتا ہے۔ جس مقدمے کے کاغذات میں بھیج رہا ہوں وہ پانچ چھ دن سے زیادہ نہ لے گا۔ امید ہے آپ کے پاس اس مقدمہ کی تیاری کے لئے کافی وقت ہوگا۔"

(۵)

بہار کا المناک زلزلہ اور کشمیر

۳۴ء کے شروع میں بہار ایک ہولناک زلزلہ سے دوچار ہوا۔ جس نے سارے صوبے میں صفِ ماتم بچھادی۔ نعیم الحق صاحب (وکیل پٹنہ) ان حالات میں بھی اپنے عزم پر قائم ہیں۔ وہ اپنی اور اپنے خاندان کی پریشانی سے ذرہ بھر بھی متاثر نہیں ہیں۔ اپنا ملّی فریضہ ادا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اقبال اُنھیں لکھتے ہیں۔

"نوازش نامہ کے لئے جو ابھی موصول ہوا ہے سراپا سپاس ہوں۔ مجھے پٹنہ میں دوستوں کے متعلق حد درجہ تشویش تھی۔ اور میں تار دینے ہی والا تھا کہ آپ کا نوازش نامہ موصول ہوگیا۔ زلزلہ کی ہولناکی سے طبیعت پر غم ویاس کی فراوانی اور پریشانی اور پریشان خاطری کے باوجود مقدمہ کی پیروی کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے آپ کی ہمت و مستعدی لائق صد ہزار داد و ستائش ہے۔ مجھے میرپور کے دوسرے مقدمہ کی نقل فیصلہ موصول ہوگئی ہے لیکن ابھی دوسرے کاغذات کا انتظار ہے۔"

نعیم الحق صاحب اس دوسرے مقدمہ کی پیروی کے لئے بھی (پہلے مقدمے کے علاوہ) تیار ہیں۔ اقبال ان کے اس جذبہ کی قدر کرتے ہوئے اس خط میں لکھتے ہیں۔

"میں سمجھتا ہوں اس مقدمہ کی پیروی کا بار بھی آپ پر ہی ڈالنا آپ کو حد درجہ زحمت میں مبتلا کرنا ہے۔ جہاں تک آپ کے مددگار کا تعلق ہے۔ میں لاہور ہی میں کسی کو آمادہ کر لوں گا تاکہ وہ لاہور ہی سے آپ کے ساتھ ہو جائے۔ یا پھر جموں میں آپ سے آن ملے۔

جموں کانفرنس آپ کی میزبان ہوگی۔ آپ شیخ عبدالحمید صاحب کو تحریر کر دیں۔ میں نے شیخ عبداللہ صاحب، صدر کانفرنس سے بھی تذکرہ کر دیا ہے۔ وہ اس وقت لاہور میں نہیں۔ لیکن جموں میں آپ کی تشریف آوری تک پہنچ جائیں گے۔ تکلیف کے لئے دوبارہ شکریہ عرض کرتا ہوں۔"

(۵)

سر ظفر اللہ خاں کا تذکرہ

لیکن عین اس وقت جب نعیم الحق صاحب کشمیر کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے اچانک ایک نئی اور عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ ۹۔ فروری ۱۹۳۴ء کے مکتوب میں اقبال نعیم الحق صاحب کو اطلاع دیتے ہیں۔

"نوازش نامہ موصول ہوا جس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ جس مقدمہ کی پیروی کے لئے میں نے آپ سے درخواست کی تھی۔ اس کی پیروی چودھری محمد ظفر اللہ خان کریں گے۔ عبدالحمید صاحب نے مجھے یہ اطلاع دی ہے اور میں نے ضروری سمجھا کہ آپ کو ہر قسم کی زحمت سے بچانے کے لئے فی الفور

آپ کو مطلع کرنا چاہئے۔

چودھری ظفر اللہ خان کیونکر اور کس کی دعوت پر یہاں جا رہے ہیں۔

یہ مجھے معلوم نہیں۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔ میں اس تمام زحمت کے لئے جو آپ برداشت کر رہے ہیں اور اس تمام ایثار کے لئے جو آپ گوارا فرما رہے ہیں۔ بے حد ممنون ہوں۔"

نعیم الحق صاحب کے ایثار کی قدر نہ کی گئی۔ وہ جاتے جاتے رہ گئے۔ چودھری ظفر اللہ خاں کے یکایک نمودار ہونے کے بعد حالات سنبھل نہ سکے۔ اختلافات باہمی نے اور زیادہ تکلیف دہ صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مفید تحریک خود بخود ختم ہو گئی۔ گویا اقبال ہی کے الفاظ میں

آزمودہ ایک فتنہ اور ہے گردوں کے پاس
سامنے تقدیر کے رسوائی تدبیر دیکھ

قادیانیّت

وُہ نبوّت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوّت میں نہیں قوّت و شوکت کا پیام

ہوس ہنوز تماشاگرِ جہانداری است
دگر چہ فتنہ پسِ پردہ ہائے زنگاری است؟
زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشق مسلمان و عقل زناری است

امیرِ قافلہ سخت کوش و پیہم کوش
کہ در قبیلۂ ما حیدری ز کراری است

(۶)

قادیانیت

قادیانیت۔ مسلمانوں میں اختلاف و افتراق کی موجب بنی۔ اس نئے دین یا نئی تحریک نے مسلمانوں کے مذہب اور سیاست دونوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ امتناع جہاد۔ اور دعوائے نبوت ان دونوں چیزوں نے عام مسلمانوں کے اندر ایک عجیب اور تکلیف دہ فتنہ کی صورت اختیار کر لی۔

اقبال کے بڑے بھائی جو انہیں بے حد محبوب بھی تھے۔ قادیانی مسلک کے پیرو تھے۔ بایں ہمہ اقبال کو نہ صرف قادیانیت سے کوئی لگاؤ نہ تھا بلکہ وہ اس سے بیزار۔ اور برہم تھے۔ اپنے اشعار میں بھی انہوں نے اس مسلک پر ضرب لگائی ہے۔ اور سیاسی قیادت کے زمانہ میں بھی انہوں نے اس پر حملہ کیا ہے۔ ان دونوں چیزوں پر ہم اپنے اپنے موقع پر گفتگو کریں گے۔ سردست ہمارے پیش نظر وہ خطوط ہیں جو مختلف اصحاب کو اس مسئلہ سے متعلق انہوں نے تحریر کئے ہیں۔ ان خطوط کے پس منظر میں ہی آگے چل کر اقبال کے مسلک کو ہم صحیح طور پر سمجھ سکیں گے۔

(۱)

ختمِ نبوّت

علامہ سید سلیمان ندوی کو (مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۲۴ء) اقبال ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"والا نامہ ابھی ملا ہے۔ جس کے مضمون سے بہت تسکین ہوئی۔ انجمن حمایت اسلام کا صدر مجھے منتخب کیا گیا تھا۔ مگر میں نے بعض وجوہ سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ کونسل میں اختلاف ہے۔ اور عام حالت اس انجمن کی اچھی نہیں ہے بعض ارکان ذاتی غرض سے اس میں داخل ہیں۔ اور ان کے نزدیک انجمن ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور بس اس وقت وہی جماعت جلسہ کی تیاریاں کر رہی ہے۔ مگر آپ ضرور تشریف لائیے۔ یہاں کے لوگوں کو ختم نبوت کے سلسلہ میں بڑی دلچسپی ہے۔ اور آپ کی تقریر انشاء اللہ بے حد توجہ سے سُنی جائے گی۔ اس کے علاوہ میں ایک مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں۔ میرے ہی غریب خانے پر ٹھہریئے۔"

(۲)

قادیانی فتنہ

اسی سلسلہ میں اقبال کا پہلا خط ایک طالب علم کا خط معلوم ہوتا ہے۔ جو ختم نبوت کے مسئلہ سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں کسی مستند عالم کی زبان سے مذہبی نقطۂ نظر معلوم کرنے کا جویا ہے۔ لیکن دوسرا خط (اور ان دو کا درمیانی فاصلہ ۱۲

سال کا ہے) لب و لہجہ۔ اور تیور کے لحاظ سے بالکل بدلا ہوا ہے۔

"الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں مگر حال کے روشن خیال علمأ کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و مانع بیان شائع فرمایئے میں بھی تیسرا بیان انشأ اللہ جلد لکھوں گا۔ اس کا موضوع ہو گا "بروز" لفظ بروز کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجیئے۔ نہایت شکر گذار ہوں گا۔"

محمد اقبال ۱۷۔ اگست۔ ۱۹۳۶ء

(۳)

قادیانی مذہب

پروفیسر الیاس برنی۔ (عثمانیہ یونیورسٹی۔ مرحوم حیدرآباد۔ دکن) نے مذکورہ عنوان سے ایک طویل و ضخیم کتاب تحریر فرمائی۔ اس میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ صرف مرزا صاحب کے اقوال اور کلمات کا اقتباس پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ "مذہب معلوم و اہل مذہب معلوم" اقبال انہیں لکھتے ہیں۔

۶۔ جون۔ ۱۹۳۶ء

مخدومی جناب پروفیسر الیاس

آپ کا والانامہ ابھی ملا ہے۔ کتاب "قادیانی مذہب" اس سے بہت پہلے موصول ہو گئی تھی۔ مجھے یقین ہے۔ کہ یہ کتاب بے شمار لوگوں کے لیے چراغِ ہدایت کا

کام کرے گی۔ اور جو لوگ قادیانی مذہب پر مزید لکھنا چاہتے ہوں، ان کے لیے تو یہ ضخیم کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ جس سے ان کی محنت و زحمت بہت کم ہو گئی ہے میں آپ کی خدمت میں مفصل خط لکھتا مگر دو سال سے بیمار ہوں۔ اور بہت کم خط و کتابت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ حضور نظام کا خط میری نظر سے گزرا تھا۔ لیکن میں نے سنا ہے۔ کہ جو روپیہ ان کی گورنمنٹ کی طرف سے پنجاب میں آتا ہے وہ یا تو پارٹی پالٹکس پر صرف ہوتا ہے۔ یا ان اخباروں پر جو قادیانیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے۔ میں نے یہ بات آپ کو بصیغۂ راز لکھ دی ہے۔

(۳۴)

پیغمبر کا کام

اقبال کو قادیانیت پر ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ یہ مذہب انگریز کی وفاداری کی تلقین کرتا ہے جہاد کا مخالف ہے۔ آزادی کا مانع اور غلامی کا حامی۔ حالانکہ پیغمبروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ غلاموں کو آزاد کرائیں۔ اور بادشاہ بنا دیں۔ لیکن قادیانیت نے ایک حریت خواہ قوم کو غلامی پر رضامند کرنے کی کوشش کی۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے ایک بیان اس مسلمہ روش کے خلاف دیا۔ اقبال یہ بیان پڑھ کر چونکے۔ الیاس برنی کو لکھتے ہیں۔

"آپ نے مرزا محمود کا تازہ اعلان پڑھا ہو گا۔ جس میں وہ لکھتے ہیں کہ پیغمبر قوموں کو آزادی دلانے کے لیے آتے ہیں۔ نہ کہ غلامی۔ سکھانے کے لیے

اس بنا پر اپنے پیروؤں کو سیاسیات میں حصّہ لینے کی تاکید کی ہے۔"

(۵)

مسئلہ بروز

خالص علمی اور تحقیقی طور پر یعنی محض جذبات اور جذباتیت سے ہٹ کر اقبال اس مسئلہ (قادیانیت) پر غور کرتے رہتے تھے۔ اس کی بنیاد مسئلہ بروز ہے۔ اس کی تحقیق وہ خود بھی کرتے رہے اور اپنے دوستوں کو بھی دعوت دیتے رہے۔ کہ وہ اس کی اصل و حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ پروفیسر الیاس برنی کو (۸ مئی ۱۹۳۷ء) لکھتے ہیں۔

"آپ کی کتاب "قادیانی مذہب" کا نیا ایڈیشن جو آپ نے بکمال عنایت ارسال فرمایا ہے مجھے مل گیا ہے۔ جس کے لیے بے انتہا شکر گزار ہوں۔ میں نے مذیر نیازی۔ ایڈیٹر طلوع اسلام سے سنا ہے۔ کہ یہ کتاب بہت مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کی محنت قابل داد ہے۔ اس سے عامۃ المسلمین کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے۔ اور آئندہ بھی پہنچتا رہے گا۔ اب ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ جو آپ کے ذاتی افکار کا نتیجہ ہو۔ آپ کے قلم سے مسلمان ایسی توقع کا حق رکھتے ہیں۔ قادیانی تحریک یا یوں کہیے کہ بانی تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ مذکور کی تحقیق تاریخی لحاظ سے از بس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔ میری ناقص رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لئے کافی

ہوگی۔"

(۶)

مسیحیت۔ مہدویت۔ مجددیت

ایک صاحب قادیانیت سے متاثر ہو کر اس باب میں اقبال کی رائے دریافت کرتے ہیں۔ اقبال نے انہیں اس سلسلہ میں اپنے خیالات قلم بند کر کے بھیج دیئے۔ (مورخہ ۷۔ اپریل۔ ۱۹۳۲ء) ان خیالات کی روشنی میں اقبال کے مسلک کی تعیین بہت آسان ہو جاتی ہے۔

"آپ کو کسی عالم سے یہ سوالات کرنے چاہئیں۔ جو آپ نے مجھ سے کئے ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ آپ کو صرف اپنا عقیدہ بتا سکتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ میرے نزدیک مہدویت۔ مسیحیت۔ اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح اسپرٹ سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے بعض علما یا دیگر قائدین کو مجدد یا مہدی کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ مثلاً محمد ثانی فاتح قسطنطنیہ کو مورخین نے مہدی لکھا ہے۔ بعض علماء امت کو بھی امام اور مجدد کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں۔ زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کا مستحق ہے تو وہ صرف جمال الدین افغانی ہے۔ مصر و ایران۔ و ترکی و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ جب کوئی لکھے گا۔ تو اسے سب سے پہلے عبدالوہاب

نجدی اور بعد میں جمال الدین افغانی کا ذکر کرنا ہوگا۔"

(۷)

لاہوری جماعت

اس خط میں آگے چل کر اقبال نے لاہوری جماعت پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس (لاہوری نہ قادیانی) جماعت میں اشاعت اسلام کا جو ولولہ پایا جاتا ہے۔ اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"باقی رہی تحریک احمدیت۔ سو میرے نزدیک لاہور کی جماعت میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کو میں غیرت مند مسلمان جانتا ہوں اور ان کی اشاعت اسلام کی مساعی میں ان کا ہمدرد ہوں۔ کسی جماعت میں شریک ہونا یا نہ ہونا انسان کی ذاتی افتاد طبیعت پر بہت کچھ انحصار رکھتا ہے۔ تحریک میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ آپ کو خود کرنا چاہیے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ جن طریقوں پر اس وقت تک عمل ہوا ان کے علاوہ اور طریق بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے عقیدہ ناقص میں جو طریق مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ زمانہ حال کی طبائع کے لیے موزوں نہیں ہے۔ ہاں اشاعت اسلام کا جوش جو ان کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے۔ قابل قدر ہے۔"

خط کے آخری الفاظ اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ اقبال کسی مسلک سے کتنا ہی سخت و شدید اختلاف رکھتے ہوں اور اس مسلک کے حامیوں اور داعیوں پر کیسے ہی تند و تلخ لہجہ میں نکتہ چینی کرتے ہوں لیکن ان میں اگر کوئی قابل تعریف و تحسین بات نظر

آتی تو اس کے اعتراف و اعلان میں ذرا بھی تامل اور جھجک محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کی دیانت فکر کا یہی سب سے بڑا ثبوت ہے۔

اقبال

اور

سیاستِ ملّی

حصّہ دُوم

خُطبات۔ تقارِیر۔ بیانات

پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی

اقبال جب پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ایوان میں ممبر کی حیثیت سے داخل ہوئے تو جہاں قدر شناسوں اور مداحوں نے ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کیا۔ وہاں ایک گروہ عقیدت کیشوں کا ایسا بھی تھا جو کونسل کی ممبری کو شاعرِ مشرق کے لیئے موجب اہانت سمجھتا تھا۔ ساتھ ساتھ نکتہ چینوں اور "قوم پرستوں" کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اقبال کے وجود کو اپنے مقاصد کے لیے سنگ گراں تصور کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کونسل میں آکر اقبال اس کے چہرے سے نقاب الٹ دیں گے اور ہوا بھی یہی۔ اقبال نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں جتنی تقریریں کیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(۱) ۔ اگرچہ کانگرس یا مجلس احرار سے انہیں نظریاتی اختلاف تھا۔ بایں ہمہ انہوں نے حکومت کو اس کی غلط روی پر سختی سے ٹوکا۔

(۲) ۔ مسلمانوں پر جو زیادتیاں ہندو وزرأ کی طرف سے ہوتی تھیں انہیں بے نقاب کیا۔ اور اعداد و شمار کی روشنی میں پنجاب کی مسلم اکثریت کی مظلومیت اور ہندو اقلیت کی جارحیت اور چیرہ دستی پر واشگاف الفاظ میں نکتہ چینی کی۔

(۳) طبقاتی پسماندگی کے تدارک اور رفعیہ کے سلسلہ میں انہوں نے جو تجویزیں پیش کیں۔ یا تقریریں کیں۔ ان میں ہندو مسلم سوال پیدا نہیں کیا۔ بلکہ سب کی فلاح و بہبود کا اصول پیش نظر رکھا۔

(۴) حکومت پر اقبال نے نکتہ چینی کرنے میں اور اسے ہدف تنقید بنانے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ لیکن ان کی تنقید اور نکتہ چینی کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ تعمیری ہوتی تھی۔ وہ اگر اعتراض کرتے تھے۔ تو مسئلہ کا حل بھی پیش کرتے تھے۔ وہ صرف تخریب کے قائل نہیں تھے۔ تعمیری تخریب پر عامل تھے۔ کسی چیز کا ڈھا دینا تو کوئی کام نہ ہُوا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تخریب تعمیر کے لیے ہو۔ اقبال اگر کسی چیز کو بگاڑنا چاہتے تھے۔ تو بنانے کے لیے سنوارنے کے لیے۔

(۵) کونسل میں دیسی اور بدیسی کا مسئلہ جب کبھی زیر بحث آیا۔ تو اقبال نے ہمیشہ بدیسی کے مقابلے میں دیسی کو ترجیح دی۔

(۶) اقبال ایک حساس دل اپنے پہلو میں رکھتے تھے مصیبت زدہ اور تباہ حال لوگوں کو دیکھ کر ان کا دل کڑھتا تھا۔ پھر وہ خاموش نہیں رہ سکتے۔ پنجاب کونسل میں کانگرس پارٹی بھی تھی۔ اور اس کے ممبر گرمیٔ گفتار کے مظاہرہ میں سب سے آگے رہتے تھے۔ یہ لوگ کھدر کا لباس پہنتے تھے۔ خاکساری اور فروتنی کے پیکر بنے رہتے تھے۔ "حق" کی حمایت۔ اور ظلم کے مقابلہ کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً جیل بھی جایا کرتے تھے۔ پولیس کی لاٹھیاں بھی اپنے سروسینہ پر کھاتے تھے۔ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو شیر کی طرح گرجتے تھے انہیں اپنی عوامیت پر۔ عوام پسندی پر۔ عوامی زندگی پہ ناز تھا۔ لیکن یہی وہ لوگ تھے جو مزدوروں کا پسینہ اور کسانوں کا خون بھی چوستے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی کسانوں اور کاشتکاروں کی تائید و حمایت میں ایسی مدلل اور مبرہن۔ شگفتہ اور بلیغ۔ عالمانہ اور معلومات سے بھری ہوئی تقریریں نہیں کیں۔ جیسی اقبال نے کیں۔ میرا تو خیال ہے اقبال کی بعض دلو

آفرین نظمیں مثلاً

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو!

کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی

اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

انہی تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ جو کونسل کی ممبری کے زمانہ میں حالات و حقائق کے مشاہدے کے بعد اقبال کے ذہن و دماغ پر طاری ہوئے۔ کیونکہ یہی وہ مقام تھا جہاں انہوں نے سرمایہ داری، جاگیرداری اور مصنوعی "نیشنلزم" کا روے زشت پورے طور پر بے نقاب دیکھا۔

پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں اقبال نے پانچ سال کی مدت میں مختلف مسائل پر متعدد تقریریں کیں۔ ان میں سے چند مخصوص عنوانات پر اقبال کے خیالات انتہائی اختصار کے ساتھ ہم پیش کرتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ تعمیری، عوامی اور اجتماعی مسائل پر وہ کتنے صحت مند نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ حقوقِ ملّی کے حفظ و دفاع کے سلسلہ میں وہ کس طرح دوستی اور ذاتی تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر شمشیرِ برہنہ بن جایا کرتے تھے۔

(۱)

انکم ٹیکس اور لگان

پنجاب کے تباہ حال زمیندار کی وکالت

پنجاب کا زمیندار چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ ایک طرف انگریزی حکومت تھی جو کم سے کم زمین پر بھی سرکاری لگان معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔ اس لیے کہ وہ زمین کی "مالک" تھی۔ دوسری طرف ساہوکار اور بنیئے تھے جن کے قرض اور پھر سود در سود کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ غریب زمیندار کی کمر توڑے دیتا تھا۔ ۲۸ رفروری ۱۹۲۷ء کو اسمبلی میں سرجیوفرے ڈی مانٹ مورنسی۔ فنانس ممبر نے بجٹ کی تقریر پڑھی۔ اور مسٹر ایمرسن (یہ دونوں حضرات بعد میں پنجاب کے گورنر بنے) فنانس سیکرٹری نے اپنی یادداشت پیش کی۔ ۵ مارچ ۱۹۲۷ء کو بجٹ پر بحث کے دوران میں اقبال نے ایک یادگار اور معرکۃ الآرا تقریر کی۔ اس تقریر میں انہوں نے وقت کے نہایت اہم مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور وضاحت کے ساتھ ایک ایسے موقف پر حکومت کو متوجہ کرنے کی کوشش کی جو ایک طرف اقبال کے غیر مشروط حُبّ وطن کا ثبوت ہے۔

دوسری طرف ان کی غیر معمولی ذہانت کا۔ شہریوں کے انکم ٹیکس اور کسانوں کے لگان کے سلسلہ میں حکومت کی امتیازی پالیسی پر انہوں نے جو "فارمولا" پیش کیا وہ اپنی افادیت اور اہمیت کی بنا پر آج بھی اس قابل ہے کہ اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔

اقبال نے اپنی تقریر میں کہا۔

"ہم انکم ٹیکس میں تو تدریجی ترقی کے اصول کو استعمال کرتے ہیں لیکن لگان میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ تدریجی ترقی کے اصول کو لگان میں استعمال نہ کرنے کا جواب بعض اوقات غیر متمدن نظریات میں یہ پایا جاتا ہے ملکہ زمین حکومت کی ہے۔ لیکن ملکیت کا دعویٰ نہ تو قدیم ہندوستان میں کیا گیا۔ اور نہ شاہان مغلیہ کے دور میں۔ یہ اس بحث کا تاریخی پہلو ہے۔ "لیجسلیٹو انکوائری کمیٹی" نے بھی اس اصول کو تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ کمیشن کے نصف ممبروں کا تو یہ خیال تھا کہ مالیات اراضی ٹیکس نہیں کہلایا جا سکتا اور باقی نصف اسے ٹیکس ہی خیال کرتے ہیں۔ تاہم یہ مسلّمہ امر ہے کہ اس ملک میں بادشاہوں نے اس قسم کے حقوق کا مطالبہ نہیں کیا۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ مغلوں کے زمانے میں یہ اصول رائج تھا۔ لیکن پنجاب کے لوگ اس صوبے کی زمین پر خاندانِ مغلیہ کے یہاں آنے سے بہت پہلے قابض تھے۔ بادشاہ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور اس حیثیت سے صرف اہل ملک ہی غیر فانی ہیں۔

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
خراج شہر و گنج و کان او رفت

تو خود را از شہان پائندہ تر دان
نمے بینی کہ ایران ماند و جم رفت

لہٰذا میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی ملک میں یہ نظریہ رائج بھی تھا۔ تو بھی بیسویں صدی میں یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہمیں لگان میں مدریجی ترقی کے اصول کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اس وقت تمام زمینوں پر لگان دیا جاتا ہے۔ خواہ کوئی آدمی دو کنال زمین کا مالک ہو۔ خواہ دو سو کنال کا۔ سب کو مالیہ دینا پڑتا ہے۔ انکم ٹیکس میں تدریجاً ٹیکس ادا کرنے کا اصول عمل میں لایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک تو وہاں درجہ وار محصول بندی ہے۔ دوسرے کچھ لوگ ٹیکس سے قطعی طور پر بری ہیں۔"

(۲)

غیر ملکی حکومت اور تعلیم

کونسل کے اسی سیشن میں ۱۰ مارچ کو اقبال نے ایک اور تقریر کی۔ یہ تقریر محکمہ تعلیم سے متعلق ایک تحریک تخفیف پر تھی۔ اس تقریر میں اقبال نے بغیر کسی رو رعایت کے حکومت کی تغافل کیشی اور بے پروائی پر تند اور تلخ لہجہ میں اظہار خیال کیا۔ اس تقریر میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طنز لطیف کی چٹکیاں بھی موجود ہیں۔

اقبال نے اس تقریر میں کہا:-

"اس ملک کی غیر ملکی حکومت لوگوں کو غیر تعلیم یافتہ رکھنا چاہتی ہے۔ بدیشی حکومت رومن کیتھولک کلیسا کی ایک قسم ہے۔ جو ان تمام ذرائع کو مسدود کرنا چاہتی ہے۔ جس سے عوام میں روشن خیالی پیدا ہو سکے۔ کیا اس ایوان میں یا

اس ایوان سے باہر کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے۔

کہ عوام الناس کے لیے ہمیں تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ ابتدائی تعلیم یا

ثانوی تعلیم یا دستکاری عوام الناس کی تعلیم کے مختلف پہلو ہیں۔

اس ملک میں زمانۂ قدیم کے بزرگ دنیا کو مایا یا سراب کہا کرتے تھے۔

معلوم نہیں کہ اس ایوان سے باہر دنیا مایا یا سراب ہے یا نہیں لیکن

اس ایوان میں جو کچھ ہوتا ہے وہ تو سراب ہی ہے۔"

(۴)

"قومیت"

ایک پُرفریب تصوّر

کونسل کے اندر اور کونسل کے باہر اقبال کو ایک عجیب و غریب صورت حال سے دوچار ہونا پڑا اس صوبہ میں مسلمان اکثریت کے مالک تھے۔ ہندو اور سکھ اقلیت میں تھے لیکن مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ "ازیں سو راندہ و ازاں سو درماندہ"۔ صوبہ کی تجارت و زراعت کاروبار غرض معاشیات کے ہر شعبہ پر ہندو و سکھ اپنے سرمایہ کے بل پر اقتدار و اختیار کے مالک تھے۔ صرف ملازمت ایک ایسی چیز تھی جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کا سہارا تھی لیکن اس سہارے پر بھی ڈاکہ پڑ رہا تھا۔ سرکاری محکموں کی باگ ڈور زیادہ تر غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھی اور انہوں نے اپنی ذہانت سے ایک ایسا فارمولا تیار کر دیا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ "جیت بھی میری پٹ بھی میری"۔ مسلمان اگر سینیئر

ہو تو اس کی ترقی اس لیے رک دی کہ اس خاص شعبے میں وہ تجربہ کار زیادہ نہیں ہے۔ اور ایک "تجربہ کار" غیر مسلم سینیئر مسلمان کو پھلانگ کر ترقی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور اگر اتفاق سے مسلمان قابلیت کا حامل ہوا تو اسے اس لیے ترقی نہیں ملی کہ وہ سینیئر نہیں تھا لہذا غیر مسلم سینیئر کم قابلیت رکھنے کے باوجود ترقی کی دوڑ میں آگے نکل گیا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ مقابلے کے امتحانوں میں غیر مسلم ممتحن مسلم امیدواروں کو کوئی نہ کوئی پخ لگا کر ناکام بنا دیتے تھے۔

ان حالات میں سردار اجل سنگھ نے ایک تجویز پیش کی کہ تمام سرکاری ملازمتیں مقابلہ کے امتحان کے بعد پر کی جائیں۔ اس تجویز پر تقریر کرتے ہوئے اقبال نے ۹ جولائی ۱۹۲۷ء کو فرمایا۔

"میں اپنے محترم دوست کو یقین دلانا چاہتا ہوں۔ کہ مقابلہ کے امتحان کا اصول بذات خود اس ملک میں بالعموم اور اس صوبے میں بالخصوص ناقابل عمل ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اس ایوان میں بہت سے محترم ممبروں کو اس واقعہ کا علم ہے۔ کہ پنجاب یونیورسٹی ایسا غیر فرقہ وارانہ ادارہ بھی اپنے مختلف امتحانات میں فرضی رول نمبروں کو استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ اس طرح ممتحن کو اس امیدوار کے جس کا وہ پرچہ دیکھتا ہے۔ مذہب۔ ملت۔ رنگ اور کالج کے متعلق کچھ نہیں پتہ ہوتا۔ یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ خطرہ تھا کہ ہندو ممتحن مسلمان امیدواروں کو بلا وجہ فیل کر دیں گے۔ اور مسلم ممتحن ہندو امیدواروں کو (آوازیں شرم شرم)۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ایک شرمناک فعل ہے۔ لیکن اس کے امر واقعہ

ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کے باوجود ہندو اور مسلمان امیدوار اپنے پرچوں میں بعض ایسے نشانات چھوڑ دیتے ہیں جس سے ممتحن کو اس کے مذہب۔ ملت کا پتہ لگ جائے۔ کل ہی کی بات ہے کہ میں ایل ایل۔ بی کے امتحان کے پرچے دیکھ رہا تھا۔ میں نے چند پرچوں پر "۷۸۶" لکھا ہوا دیکھا۔ جو عربی کے ایک فارمولے کے ہندسوں کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح دوسرے پرچوں پر "اوم" لکھا ہوا تھا۔ جس سے مراد ایک طرف تو خدا تعالیٰ سے امداد مانگنا ہے۔ اور دوسری طرف ممتحن پر امیدواروں کی ملت کا ظاہر کرنا۔"

آگے چل کر اس تقریر میں اقبال نے ایک ایسی بات کہی جو نام نہاد قومیت متحدہ کے قصر زرنگار پر ایٹم بم کی طرح اثر انداز ہوئی انہوں نے بغیر کسی جھجک کے نہایت صفائی اور وضاحت اور بے باکی کے ساتھ ارشاد فرمایا۔

"بدقسمتی سے میرے دوست پنڈت نانک چند اس وقت یہاں نہیں ہیں انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے رنگ و نسل کا امتیاز اڑا دیا ہے۔ اور اس طرح وہ آسامیاں جو پہلے برٹش افسروں کو ملتی تھیں۔ اب ہندو اور مسلمانوں کے حصہ میں آتی ہیں۔ لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے اس معاملہ میں بڑی سخت غلطی کی ہے۔ اگر برٹش افسروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو میں اس کا خیر مقدم کروں گا۔ (آوازیں نہیں۔ نہیں۔) جب میں یہ کہتا ہوں تو اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے کہتا ہوں اور میں "نہیں۔ نہیں" کی آواز کا مطلب

خوب سمجھتا ہوں۔ میں اس سطحی قومیت سے مسحور نہیں ہوں جس کا اظہار اس طریق پر کیا جائے۔"

اقبال کی اس تحریر سے ان کے بہت سے مخلص دوست دل برداشتہ ہوئے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مغفور کے دل کو تو خاص طور پر بہت زیادہ ٹھیس لگی۔ انہوں نے اپنے موقر اخبار "ہمدرد" مرحوم میں "طبیب حاذق سر محمد اقبال کا ایک نیا نسخہ" کے عنوان سے ایک طویل مضمون کئی نمبروں میں تحریر کیا اور اقبال کے اس نظریہ کی نہایت اخلاص لیکن بہت شدت کے ساتھ مخالفت کی۔ اقبال نے مولانا محمد علی کی طرح اس مسئلہ پر صرف جذباتی حیثیت سے گفتگو نہیں کی تھی بلکہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے ٹھوس، سنگین اور ناقابل تردید حقائق کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کی عمارت تیار کی تھی۔ چنانچہ آگے چل کر اسی تقریر میں انہوں نے وضاحت اور صفائی کے ساتھ کہا تھا:۔

" متحدہ قومیت کی گفتگو بیکار ہے۔ اور بہت عرصہ تک بیکار رہی رہے گی۔ یہ لفظ پچھلے پچاس سال سے زبان زد عام رہا ہے۔ لیکن جس طرح زیادہ کڑ کڑ کرنے والی مرغی انڈہ نہیں دیتی۔ اسی طرح اس لفظ سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا۔ بہر کیف میرے خیال کے مطابق ملک کی حالت کا اقتضا یہی ہے۔ کہ مقابلہ کے امتحان کا سیدھا سادھا طریق رائج نہ کیا جائے۔ ملک کے لیے سب سے بہتر طریق وہی ہے۔ جو سر جیوغرے ڈی مونٹ مورنسی نے اپنی تقریر میں بتایا ہے۔ یعنی" انتخاب اور نامزدگی دونوں کی آمیزش ہو۔"

(۴)

ہندو مسلم فسادات ۔ خانہ جنگی کا دور

اقبال اگرچہ قومیت متحدہ کی حقیقت سے واقف تھے اور وہ کبھی بھی اس دام ہم رنگ زمین کے شکار نہیں ہوئے لیکن دل کی گہرائی سے وہ اس امر کے حامی تھے کہ ہندو اور مسلمان مذہبی اختلافات کے باوجود اتحاد و اتفاق کی زندگی بسر کریں اور کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ ملک کی یہ دونوں بڑی قومیں آشتی اور یگانگت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں ۔ ۱۸ / جولائی ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل میں فرقہ وارانہ منافرت پر جو تحریک التواء پیش ہوئی تھی اس پر تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا :۔

"تجاویز کی تو کمی نہیں لیکن ان پر عمل کرنے کے لیے کوئی آمادہ نظر نہیں آتا ۔ لاہور میں فسادات کے فوراً بعد مختلف خیالات اور افکار کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا ۔ اس کمیٹی کا ایک اجلاس رائے بہادر موتی ساگر کے دولت کدہ پر منعقد بھی ہوا تھا ۔ لیکن مجھے بجد افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے ۔ کہ یہ اجلاس پہلا اور آخری اجلاس تھا ۔ اس میں میں نے یہ تجویز پیش کی تھی ۔ کہ باہمی منافرت کو دور کرنے کے لیے کمیٹی کے لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ کہ بہت سی چھوٹی چھوٹی سب کمیٹیاں بنائی جائیں ۔ جن کا یہ فرض ہو ۔ کہ وہ شہر کے مختلف حصّوں میں جا کر لوگوں سے باہمی تنازعات کی خرابی واضح کریں ۔ لیکن میری تجویز کا وہی حشر ہوا ۔ جو عام طور پر اس قسم کی تجاویز کا ہوتا ہے ۔" ہم نے بہت سے

مقدس مباحثے کیئے۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔"

"اس ایوان میں باہمی رفاقت کے لیے دھواں دھار تقریریں کی جاتی ہیں۔ مشترکہ کمیٹیاں اور مفاہمتی بورڈ بنانے کے لیے کیا کیا کیا جاتا ہے لیکن اس ایوان کے ہر ممبر پہ میں یہ امر اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ لیت و لعل سے معاملات سدھر نہیں سکتے۔ اگر آپ کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اس میں مزید تاخیر قطعاً نہیں ہونی چاہیئے۔ مجھے معلوم نہیں اگر ممبروں کو اس امر کا احساس ہو چلا۔ کہ حقیقتاً ہم ایک خانہ جنگی کے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور اگر اس خانہ جنگی کو دبانے کے لیے سخت تجاویز عمل میں نہ لائی گیئں ۔ تو تمام صوبہ کی فضا مسموم ہو جائے گی۔"

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے اقبال نے چودھری سر ظفر اللہ خان کی مجوزہ فرقہ وارانہ گول میز کانفرنس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا:۔

"جلد از جلد ایک گول میز کانفرنس کا انعقاد کرنا چاہیئے۔ جس میں گورنمنٹ کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے۔ اس کانفرنس کو موجودہ حالات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اور اس قسم کی تجاویز پیش کرنی چاہیئں۔ جو موجودہ کھچاوٹ کو دور کر سکیں۔ اگر یہ فرقہ وارانہ منافرت ملک کے دوسرے حصوں پر بھی اثر انداز ہوئی اور دیہات میں رہنے والوں نے بھی ایک دوسرے کا گلا کاٹنا شروع کر دیا۔ تو پھر خدا تعالےٰ ہی جانتا ہے۔ کہ اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا۔"

(۵)

انگریزی اور دیسی طریقۂ علاج

۲۲ر فروری ۱۹۲۸ء کو یونانی اور آیور ویدک طب کے ایک ریزولیشن پر تقریر کرتے ہوئے ایک محب وطن، ایک قوم پرست اور ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے اقبال نے کہا :۔

"اس ملک میں یہ خیال بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔ کہ حکومت ایک طرف تو مغربی طب کی حمایت اور دوسری طرف ملکی طب کی عدم حمایت اس لیے کر رہی ہے۔ کہ اس کے پیشِ نظر تجارتی اغراض ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس نظریہ میں سچائی کس حد تک ہے۔؟ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ طب یونانی اور آیور ویدک حکومت کی حمایت سے محروم ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ان تمام باتوں کے باوجود جو طب مغرب کی حمایت میں کہی جا سکتی ہیں۔ اس کو اب بھی طب یونانی سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ طب یونانی کے متعلق بہت سی کتابیں بالخصوص سمرقندی کی تصانیف اب تک شائع نہیں ہو سکیں۔ یورپ کے کتب خانوں میں بہت سی ایسی کتابیں موجود ہیں جن کے شائع ہونے سے ان لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ ہم یہ امر بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہندوستان ایک غریب ملک ہے۔ اور یہاں کے باشندے قیمتی دواؤں کا استعمال نہیں کر سکتے۔ اس لیے ایسے نظام کو رواج دینا ضروری ہے۔ اس امر کے پیشِ نظر میرا خیال ہے۔ کہ یونانی اور آیور ویدک طبی نظام ہمارے

لیے زیادہ مناسب ہے۔ یہ درست ہے کہ جس طریق پر ہماری دوائیاں تیار کی جاتی ہیں۔ وہ ناقص ہے۔ اور اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے۔ جو دواسازی سکھائے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا اپنا دواسازی کا طریقہ دوسرے طریقوں کے مقابلہ میں ہماری صحت کے لیے موزوں ہے۔"

(۶)

زمین کا مالک کسان ہے یا حکومت؟

اقبال کو اس بات سے سخت اختلاف تھا کہ زمین کی مالک حکومت ہے وہ زمین کو کاشتکار کی ملکیت تصور کرتے تھے اور جب کبھی موقع ملتا تھا دلائل و براہین کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے تھے چنانچہ انکم ٹیکس کے اصولوں کو محاصل اراضی پر عاید کرنے کے ایک ریزولیشن پہ تقریر کرتے ہوئے ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو پنجاب کونسل میں اقبال نے کہا:۔

"پیرون ثانی ایک فرانسیسی سب سے پہلا یورپین مصنف تھا۔ جس نے ۱۷۷۷ء میں اس نظریے کی تکذیب کی۔ اس کے بعد ۱۸۳۰ء میں برگز نے (BRIGGS) ہندوستانی قانون و رواج اور زمین پر حکومت کے مالکانہ حقوق کے متعلق وسیع تحقیقات کیں۔ وہ اپنی کتاب میں منو کے قوانین اسلامی قوانین۔ اور دیگر طریقوں کا جو ہندوستان کے مختلف حصوں مثلاً بنگال مدراس۔ اور پنجاب میں رائج ہیں۔ بالکل صحیح نقشہ پیش کرتا ہے

اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ کہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی دور میں بھی حکومت نے زمین کی ملکیت کا دعوےٰ نہیں کیا۔ صرف لارڈ کرزن کے عہد میں یہ نظریہ پیش کیا گیا۔"

پھر آگے چل کر اس سلسلے کے بعض دوسرے پہلوؤں پر تشریح و تفصیل سے گفتگو کرنے کے بعد اقبال نے کہا :-

"بہر صورت ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ لگان کا موجودہ طرز تعین کہاں تک انصاف پر مبنی ہے ؟ مانا کہ یہ قابل عمل بھی ہے۔ اور اس کی پشت پر دیرینہ روایات بھی ہیں۔ بایں ہمہ سب سے پہلے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کے ساتھ انصاف بھی ہے یا نہیں ؟ میں تو یہ عرض کروں گا۔ کہ یہ طریقہ سراسر غیر منصفانہ ہے۔ اور اس کی غیر معقولیت بالکل واضح ہے۔ زمیندار چھوٹا ہو یا بڑا اسے ہر حالت میں لگان ادا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کی آمدنی زمین کے علاوہ دوسرے ذرائع سے ہو۔ اور یہ سالانہ آمدنی دو ہزار روپیہ سے کم ہو تو اسے کوئی ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ بے انصافی ہے۔ اس بات میں تو کوئی معقولیت نہیں کہ چونکہ اس بے انصافی کو دور کرنے کی راہ میں ناقابل عبور مشکلات حائل ہیں۔ اس لیے اس لعنت کو مستقل بنا دیا جائے۔ ہمیں اس ظلم کا اعتراف کر لینا اور حتی الوسع اس کو دور کرنے کے لیے مناسب سدِ باب کرنا چاہیے۔"

اقبال کی یہ تقریر خاصی طویل تھی۔ آخر میں انھوں نے بڑی قابلیت کے

ساتھ وزیر مال کے دلائل کا تجزیہ فرمایا:۔

"فاضل وزیر مال نے دو دلیلیں پیش کی ہیں۔ اول وہ فرماتے ہیں کہ صوبے کی ترقی کے لیے روپیہ درکار ہے۔ لیکن گورنمنٹ کیمیاگری نہیں کرسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ گورنمنٹ کو اس وقت تک کیمیاگری کی ضرورت نہیں جب تک اس کے قبضہ میں وہ کسان ہیں جن کی محنت و مشقت مٹی کو سونا بنادیتی ہے۔ لیکن اس قسم کی دلیل ایسے عمل کے دفاع میں پیش کی جاسکتی ہے جس سے حسب ضرورت روپیہ فراہم ہوسکے۔ اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ یہ دلیل کچھ وزن رکھتی ہے پھر بھی میں یہ گزارش کروں گا کہ لگان کے طریقے میں ترمیم کے سبب مالگزاری میں جو کمی ہوگی وہ دوسرے طریقوں سے پوری کی جاسکتی ہے۔ مثلاً ہم نظم ونسق کے اخراجات میں کمی کرسکتے ہیں یا انکم ٹیکس ایکٹ کے ماتحت قابل تخصیص آمدنی کی مد کو کم کرسکتے ہیں۔ ہم "ترقیات" پر کم خرچ کرسکتے ہیں جس کا نام تو کافی شاندار ہے لیکن جس نے اب تک ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

آنریبل وزیر مال کی دوسری دلیل ہے کہ مالگزاری کا بار تو سارا بوجھ صارف کے تن حصول پر پڑتا ہے۔ یا صارف بالواسطہ اس بوجھ کے کچھ حصہ کا حامل ہوتا ہے۔ دلیل بظاہر معقول ہے۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے اس کے جواز میں شک ہے۔ ہمیں صوبے کی صورت حالات کو کبھی بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم بٹائی کے طریقہ کو بہت عرصہ سے چھوڑ چکے ہیں۔ (وزیر مال۔ "ابھی نہیں")۔ عملی طور پر تو اب ہوچکا ہے۔ قانون لگان اراضی بٹائی کو تسلیم نہیں کرتا۔ میرے خیال میں معاشی نقطہ نظر سے بٹائی کا طریق بہتر ہے۔ بہرحال زمینی پیداوار کی قیمتوں

کا تعین صارف کی طلب سے ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ آنریبل وزیر خزانہ نے فرمایا ہے۔ زمین کے لگان کا تعین قیمتیں کرتی ہیں۔ لیکن جب ایک دفعہ لگان کا تعین ہو جاتا ہے۔ تو پھر ساون دہی شرح چپکی رہتی ہے۔"

تقریر کے آخر میں غریب کسانوں اور کاشتکاروں کا مسئلہ حل کرنے کے لیئے ایک نہایت موزوں اور مناسب تجویز پیش کی گو یہ تجویز انگریز حکمرانوں نے منظور نہیں کی لیکن اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ہماری قومی حکومت کے لیے بھی قابلِ غور ہے۔ فرماتے ہیں:-

"میرا منشا یہ ہے کہ اگر آپ یہ تسلیم کر لیں کہ موجودہ طریق غیر منصفانہ ہے۔ تو اسے دور کرنے کے لیے کچھ کیجیئے۔ میرے خیال میں انکم ٹیکس کا اصول لگان سسٹم پر ٹھونسے بغیر بھی قانون لگان اراضی دفعہ ۴۸ میں ترمیم کرنے سے ایسا ہو سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ پانچ بیگھے تک وہ تمام زمین جہاں آبپاشی نہ ہو۔ اور جہاں پیداوار قطعی طور پر یقینی نہ ہو۔ لگان سے مستثنیٰ قرار دی جائے۔ انکم ٹیکس کے اصولوں کا اطلاق لگان اراضی پر کیا جائے یا نہیں۔ اس سوال کا فیصلہ کیئے بغیر بھی ایسا کیا جا سکتا ہے اگر آپ یہ فیصلہ کر دیں، کہ پانچ بیگھے تک کی زمین لگان سے مستثنیٰ ہے تو میرے خیال میں اس سے لگان میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہو گی۔ اور اگر کوئی معتد بہ کمی ہو بھی جائے۔ تو وہ دیگر اقسام کے مصارف گھٹانے سے پوری کی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں پانچ بیگھے تک قطعات اراضی کا لگان معاف کرنے کا مطالبہ کوئی بڑا مطالبہ نہیں ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ حکومت اس پر اچھی طرح غور و خوض کرے گی۔ اس صوبے میں منفعت بخش اراضی وہی

یا گیارہ بیگھے ہے۔ اور پانچ بیگھے اس قسم کی ملکیت کا نصف ہے۔ میرے خیال میں پانچ بیگھے تک زمین کا لگان معاف کر دینے سے آمدنی میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوگی۔"

تقریر ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے :۔

"بہر حال پنجاب کا زمیندار اپنی مالکانہ حیثیت ترک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس ملک میں ایسے چھوٹے چھوٹے زمیندار بھی ہیں۔ جن کی کل ملکیت دو بیگھے یا دو کنال ہے۔ ہر چند ان کی حیثیت مزارعین کی سی ہے۔ تاہم وہ انفرادی ملکیت کے حقوق سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں۔ لہذا میری گزارش ہے کہ حکومت کو اس مطالبہ پر غور کرنا چاہیئے تاکہ چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے لیے جن کی زمینی پیداوار ان کے خاندانوں کی پرورش کے لیے بھی قطعی طور پر ناکافی ہے۔ کوئی بہتری کی صورت نکل سکے۔"

(۷)

بجٹ پر ایک تقریر

۳۰-۱۹۲۹ء کے بجٹ پر ۴ مارچ ۱۹۲۹ء کو اقبال نے ایک طویل بسیط تقریر کی اس تقریر میں بجٹ کی خامیوں پر انہوں نے سیر حاصل تبصرہ کیا اور وزیر خزانہ مسٹر ایم۔ اسٹو کی تقریر کو واقعات و حقائق کی کسوٹی پر کسا۔ اس تقریر میں اقبال نے تین پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔

(۱) انسداد جرائم۔

(۲) صوبہ کے معاشی حالات کی ابتری۔

(۳) محکمۂ تعلیمات کی مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں۔

پہلی شق پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:۔

"اس کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے۔ کہ پانچ سال کی متواتر خوش حالی کے بعد ہمارے سامنے پہلی مرتبہ خسارے کا بجٹ آیا ہے۔ آب کاری اور سٹیمپس میں تھوڑا سا اضافہ ہرگز باعث اطمینان نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صوبے میں شراب خوری اور مقدمہ بازی بڑھ گئی ہے۔ جس پر نہ حکومت فخر کر سکتی ہے۔ اور نہ عوام۔ ۳۱-۱۹۳۰ء کے بجٹ میں صرف آبپاشی اور جیلوں کے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے۔ آب پاشی میں اضافہ اگست کے سیلابوں کی وجہ سے ہے۔ اور جیلوں میں اضافہ کی وجہ قیدیوں کی تعداد میں زیادتی اور اشیائے خورد و نوش کی گرانی ہے۔ سیلاب ایک قدرتی امر ہے جس کو روکا نہیں جا سکتا۔ تاہم جرائم کو ضرور کم کیا جا سکتا ہے۔ اور جرائم کے انسداد کے لیے اگر ہم مناسب ذرائع عمل میں لائیں تو کافی حد تک ان کو روکا جا سکتا ہے۔"

دوسری شق پر اقبال نے اعداد و شمار کی روشنی میں صوبہ کی معاشی ابتری کا جائزہ لے کر حکومت کی سنگ دلانہ پالیسی پر بے باکی کے ساتھ نکتہ چینی کی۔ انہوں نے اس تقریر میں کچھ اور مسائل پر گفتگو کرنے کے بعد معاشی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ہمارا صوبہ پہلے ہی مقروض ہے۔ بجٹ کے صفحہ ۲۲-۲۳ سے آپ کو صوبہ کے صحیح حالات کا پتہ لگ جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ پبلک کے قرضوں کی تعداد تین کروڑ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور حکومت ہند سے

۳۱ مارچ کے پہلے اور آئندہ سالوں میں جو قرضہ لیا گیا ہے۔ اس کی مجموعی تعداد قریباً ۶ ۲ کروڑ ہے۔ اور پھر اس رقم میں وہ قرضے شامل نہیں ہیں۔ جن کی منظوری یکم مارچ ۱۹۲۹ کے بعد دی گئی ہے۔ اور اب ہمیں مزید ۴۰ لاکھ روپیہ قرض لینا پڑ رہا ہے۔"

پھر انہوں نے قرض خواہ اور قرض دار کی اصلاح پر بحث کرتے ہوئے ایک ٹھوس اور تعمیری تجویز پیش کی۔ انہوں نے فرمایا:۔

"بقول چارلس لیمب نوع انسان کی دو قسمیں ہیں۔ قرض خواہ۔ اور قرض دار۔ میرے خیال میں جہاں تک اس صوبے کا تعلق ہے۔ اگر ہم مذہبی امتیازات یعنی ہندو مسلم اڑا دیں۔ اور اس کے بجائے اقتصادی نشانات یعنی قرض خواہ اور قرض دار اختیار کر لیں۔ تو لیمب کی تقسیم ہم پر بالکل صادق آتی ہے مجھے تو ڈر ہے۔ کہ بحیثیت مجموعی یہ صوبہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مقروض بن جائے گا اس لیے موجودہ صورت حالات نہایت مایوس کن ہے۔

بہر صورت میں ایک تجویز پیش کروں گا۔ اولاً گورنمنٹ کو چاہیے کہ حکومت ہند کو اس بات پر آمادہ کرے۔ کہ انکم ٹیکس کو صوبجاتی بنا دیا جائے۔ اس سے ہمارے صوبہ کی حالت کسی حد تک سدھر سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ انگلستان کی طرح ہمیں بھی اموات پر ٹیکس لگا دینا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ ہمیں بڑی تنخواہیں کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور مشینری ارزاں ترین منڈیوں سے خریدنی چاہیے۔"

تیسری شق یعنی مسلمانوں کے ساتھ محکمۂ تعلیم کی ناانصافیوں کی داستان

برافگندہ نقاب حقائق کی منہ بولتی تصویر تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ صوبہ کی اکثریت اقلیت کی چیرہ دستیوں سے نالاں و پریشاں تھی اور وہ آہ و فغاں کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ اسے غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے استبداد کے شکنجے میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ برطانوی سامراج نے ۱۸۵۷ء سے لے کر اپنے جانے کی آخری تاریخ یعنی ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء تک مسلمانوں پر بے پناہ مظالم توڑے۔ کونسل میں کوئی حق گو ان چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند بھی کرتا تھا تو اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی صدا بن جاتی تھی۔ اقبال کی اس تقریر کا بھی یہی حشر ہوا مگر بہر حال انہوں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ آگے چل کر آپ نے فرمایا:۔

۱۹۲۹-۳۰ء کے بجٹ میں سب سے مقدم اور غور طلب مسئلہ تعلیم کا ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے۔ صورت بہت ہی مایوس کن ہے۔ بلکہ وحشت انگیز ہے۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۵۵ نئے مدرسوں نے امدادی رقم کے واسطے درخواست کی۔ جن میں اسلامیہ سکولوں کی تعداد صرف ۱۰ تھی کل زر اعانت کی میزان ۱۰،۲۱،۹۰۶ روپے تھی۔ جس میں اسلامی اسکولوں کو صرف ۲،۹۶،۲۱۴ روپیہ ملا۔ ۲۷-۱۹۲۶ میں ہائی اسکولوں کے واسطے جو امدادی رقوم دی گئیں۔ ان کی میزان ۱۰،۲۲،۲۸۷ روپیہ ہے۔ اور اسلامی مدرسوں کا حصہ وہی ۲۹،۲۱۴ روپیہ رہا۔ جو تمام رقم کا ۲۳ فیصدی ہے۔۔۔۔

۱۹۲۷-۲۸ء میں امدادی رقوم ۱۰،۶،۱۳،۱۵۴ روپوں پر مشتمل تھی اور اسلامیہ مدرسوں کا حصہ صرف ۳،۳۰،۰۴۴ روپے بنا۔ یعنی

آبادی کے اس حصہ کو جو تعلیم کے لحاظ سے بہت زیادہ پیچھے ہے اور پڑھنے کی رنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ ۱۵ لاکھ میں کل ۲ لاکھ مل سکا۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی تسلی بخش نہیں کہلا سکتی۔

اسی طرح ۳۱-۱۹۳۰ کے بجٹ پر ۷ مارچ ۱۹۳۰ء کو انھوں نے تقریر کی تھی وہ بھی حقائق اور واقعات کا مجموعہ تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور حکومت کی فرض ناشناسی کا گلہ کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس صوبے میں پارچہ بافی اور پاپوش سازی کے پیشوں کے لیے اچھا مستقبل ہے۔ اور اگر ہم ان صنعتوں کی ترقی میں ممد ہوں۔ یعنی یہ کہ ہم احمد آباد اور کان پور کے مقابلہ میں ان کا تحفظ کر سکیں۔ تو ہم اس صوبے کو بے کاری سے ضرور نجات دلا سکتے ہیں۔

ہم نے تعلیم پر زر کثیر صرف کیا ہے۔ لیکن نتیجہ؟ اس صوبے کی تعلیمی ترقی کی رپورٹ سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ اسکولوں کی تعداد میں قریباً ۰۰۰ ,۱ اور طالب علموں کی تعداد ۰۰۰ ,۲۷ کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ رپورٹ میں اس کمی کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اسکولوں کے انسپکٹروں نے تعلیمی پراپیگنڈے سے پہلو تہی کی۔ میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اصل وجہ یہ ہے اس کا حقیقی سبب کچھ اور ہی ہے وزیر تعلیم[1] کی گزشتہ تین سال کی کارگزاری کے متعلق میرے پاس اعداد و شمار کی نقل موجود ہے۔ لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے میں ان تمام اعداد کا بیان ذکر نہیں

۱۔ آنریبل مسٹر منوہر لال

کرسکتا۔ میں آپ کی توجہ ان خصوصی امدادوں کی طرف منعطف کراؤں گا جو ۲۹-۱۹۲۸ء میں غیر امدادی اسکولوں کو ملی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ایسے اسکولوں کی تعداد جن کو یہ امداد ملی ہے ۲۱ ہے اس میں سے ۱۳ ہندو مدرسے ہیں۔ ۶ سکھ مدرسے اور صرف ۲ مسلم مدرسے۔ ہندو مدرسوں کو جو امداد ملی ہے۔ اس کی میزان ۱۲،۹۷۳ روپیہ ہے۔ سکھ مدرسوں کو ۹،۹۰۸ روپے کی امداد ملی ہے۔ اور مسلمان مدرسوں کو صرف ۲،۲۲۰ روپے کی امداد۔ لہٰذا اس قابل غور واقعہ کی اصل وجہ وہ طریق ہے۔ جس سے تعلیم پر روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔"

اقبال کے منہ سے نکلے ہوئے یہ حقائق اپنی تفسیر خود کرتے ہیں۔ اقبال کی ان تقریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جب تک اسمبلی کے ممبر رہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ اور بلاشبہ یہ ان کی بہت بڑی خدمت تھی۔

مُسلم لیگ

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ
ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دَور
خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے

ملّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

مسلمانوں کی سب سے پہلی سیاسی جماعت مسلم لیگ ہے۔ عروج و زوال کے مختلف ادوار سے اسے گذرنا پڑا، ایک زمانہ تھا کہ یہی جماعت، مسلمانانِ ہند (بشمول پاکستان) کی واحد ترجمان اور نقیب تھی مسلمانوں کی شکایات حکومت کے سمعِ مبارک تک پہنچانا، مسلمانوں کی حق تلفی پر صدائے احتجاج بلند کرنا مسلمانوں کی ملّی انفرادیت کے حصول اور قیام کی جدوجہد کرنا، اس کا کام تھا ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس میں اتحاد اور تعاون کا دور دورہ شروع ہوا۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس کی پرانی قیادت انقلابی رہنماؤں کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئی تو اس کا ڈھانچہ بالکل بدل گیا۔ پنڈت مالوی، سر سریندر ناتھ بنرجی، مسٹر تلک وغیرہ اعتدال پسند لوگ تھے، یہ نظامِ حکومت میں تبدیلی چاہتے تھے لیکن انقلاب کے تصور سے کوسوں دُور تھے۔ اب گاندھی جی، موتی لال نہرو، سی آر داس جیسے رہنما کانگریس پر چھائے ہوئے تھے جن کا نعرہ سوراج تھا، جن کا نصب العین آزادیٔ ہند تھا جو قومیت متحدہ کے علمبردار تھے۔ مسلمانوں میں ایک نئی جماعت مجلس خلافت ابھر چکی تھی، یہ جماعت، جماعت نہ تھی، طوفان تھی۔

دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اس کی قیادت مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں،

ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی جیسے انقلابیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس جماعت نے بہت جلد مسلمانان ہند کو اپنے پرچم تلے جمع کر لیا اور مسلمان سر سے کفن باندھ کر اس کی زیر قیادت میدان جنگ میں اتر پڑے۔ اسکول بند ہو گئے۔ کالجوں کے دروازوں پر تالے پڑ گئے۔ یونیورسٹیاں ویران ہو گئیں۔ کچہریوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا، سرکاری ملازمین نے ملازمتیں ترک کر دیں، وکلا نے گراں قدر پریکٹس پر لات مار دی، قید و بند کا دور شروع ہو گیا، تعزیر و عقوبت کی چکی چلنے لگی۔ جرمانے، قرقی اور ضبطیٔ جائداد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پولیس کی لاٹھیاں سروں پر بے محابا چلنے لگیں، فوج کی گولیاں سینوں کو چھلنی کرنے لگیں۔ لیکن مرنے والوں کو مرنے سے کوئی نہ روک سکا حکومت کا بے پناہ جبر و تشدد آزادی کے متوالوں کو جادۂ استقامت سے منحرف نہ کر سکا۔

مسلم لیگ اس طوفان میں نہ ٹھہر سکی، گم ہو گئی۔ بے نام و نشان ہو گئی، ختم ہو گئی۔

لیکن انقلاب اور جوش و خروش کا یہ دور بہت جلد ختم ہو گیا۔ چوری چورا کے حادثہ نے کانگریس کو ختم کر دیا۔ گاندھی جی کی گرفتاری اور سزا یابی اور پھر رہائی کے بعد خاموشی نے ہندوؤں کی جارحانہ فرقہ پرستی کو جنم دیا۔ علی برادران کی گرفتاری اور سزا یابی کے بعد حالات ابتر ہو گئے۔ ان کی رہائی کے بعد موسم بدل چکا تھا۔

رہائی کے بعد انھوں نے دیکھا گاندھی جی چپ ہیں۔ موتی لال نے ترک موالات سے قطع تعلق کر کے پھر انگریزی عدالتوں میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔ مالوی جی نے سنگھٹن کی تحریک اور سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک شروع کر کے مسلمانوں کو ہندو مسلم فساد کے ذریعہ مارنا اور ان کے مذہب پر ڈاکہ ڈالنا شروع کر دیا ہے۔ ان دونوں علی برادران نے

پھر وہی فضا پیدا کرنی چاہی جو ان کی گرفتاری سے پہلے تھی، ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپیلیں کیں اپنی قوم میں بدنام ہوئے، رسوا ہوئے لیکن ہندوؤں کی جارحانہ فرقہ پرستی نے جو بات بگاڑ دی تھی وہ پھر بن نہ سکی، مسلمانوں میں بھی جوابی تحریک شروع ہوئی، خواجہ حسن نظامی نے تبلیغ کی تحریک شروع کی جو شدھی کا جواب تھی اور اس کا مرکز دہلی میں تھا، ڈاکٹر کچلو نے تنظیم کی تحریک شروع کی۔ یہ سنگھٹن کا جواب تھا اور اس کا مرکز امرتسر تھا۔

یہ تھا وہ زمانہ جب اقبال نے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا۔ اقبال بہت بڑے فلسفی تھے، سیاست دان نہ تھے ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے، آزادیٔ ہند کے موافق تھے۔ لیکن مسلمانوں کی قسمت کا سودا کر کے نہیں۔ مجلس خلافت اب ایک بے روح جماعت تھی۔ کانگریس کا نیشنلزم اقبال کی حمیّت ملی اور غیرت قومی کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ لہٰذا وہ بے تامل مسلم لیگ میں شریک ہو گئے اور رفتہ رفتہ اس کے معتمد (سکریٹری) بن گئے۔

(۱)

مسلم لیگ سے استعفیٰ

مسلم لیگ یا کسی جماعت میں بھی شرکت سے اقبال کا مقصد حصولِ جاہ و منصب نہ تھا، مسلم لیگ کانگریس کی جارحانہ فرقہ پرستی کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہی تھی اور مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کرنے کی سعی و کوشش کر رہی تھی یہ وہ کام تھا جس کے اقبال دل و جان سے حامی و مؤید تھے۔ لیکن جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ مسلم لیگ غلط راستہ پر

جارہی ہے تو بے تامل وہ مسلم لیگ سے ترک تعلق پر بھی آمادہ ہو گئے اور جاہ و منصب سے بھی دستکش ہو گئے۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمان عجیب مصیبت میں گرفتار تھے۔ گو وہ تعداد میں سات آٹھ کروڑ تھے لیکن بہر حال اقلیت میں تھے اور اقلیت بھی نہایت معمولی۔ اقبال کی نگاہ دوربین دیکھ رہی تھی کہ فرنگی سامراج اب مائل بہ انحطاط ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے دن قریب آرہے ہیں۔ ہندوستان میں جمہوری نظام حکومت قائم ہو گا۔ اس نام نہاد جمہوریت میں مسلمان ایک بے بس اقلیت کی حیثیت رکھیں گے۔ ہندو اکثریت ہر موقع پر اور ہر مرحلہ پر انہیں نیچا دکھائے گی۔ اس کا حل انہوں نے یہ سوچا تھا کہ پراونشل اٹانومی، لامرکزیت کی صورت میں نافذ ہو۔ اس طرح پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور بنگال (شاید آسام بھی) جو مسلم اکثریت کے علاقے تھے ہندو اکثریت کی دراز دستیوں سے محفوظ رہ جائیں گے۔ اس وقت تک پاکستان یا جداگانہ مسلم مملکت کا تصور اقبال کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ لیکن جب اقبال نے دیکھا کہ ان کی یہ آواز مسلم لیگ کے ارباب اقتدار کے سمع مبارک تک نہیں پہنچی یا اگر پہنچی تو انہیں اپنا ہم نوا نہ بنا سکی تو بے تامل وہ مسلم لیگ اور اس کے عہدہ معتمدی سے مستعفی ہو گئے۔ ۲۴ جون ۱۹۲۸ء کو صدر مسلم لیگ کی خدمت میں اپنے استعفا کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا جس کے خاص اجزا یہ ہیں:

"لیگ کی یادداشت جو سائمن کمیشن کو بھیجی گئی ہے اس کی تلخیص میری نظر سے گذری۔ آپ کو علم ہے کہ مسودہ مرتب کرنے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں جو صاحب صدر کے مکان پر ہوا تھا میں نے بعض ضروری امور کے متعلق

اپنا اختلاف ظاہر کیا تھا۔ بالخصوص صوبجاتی خود اختیاری کے مسئلہ پر۔

اصل مسودہ عارضی نوعیت کا تھا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ لیگ کے دوسرے ممبران کی رائے حاصل کی جا سکے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ممبران کی ایک بڑی تعداد نے اصل مسودہ میں زیر بحث مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ان آراء کے پیش نظر ایک آخری مسودہ تیار کیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے میں آخری مسودہ کی بحث میں شریک نہ ہو سکا۔

لیکن اب اخبارات میں لیگ کی یادداشت کا اقتباس دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لیگ نے مکمل صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ ایک وحدتی (UANITARY) صوبائی نظام کی تجویز پیش کی ہے۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجوزہ نظام درپردہ دوعملی پر مشتمل ہوگا اور کسی لحاظ سے آئینی ترقی کے مترادف نہ ہوگا۔

چونکہ میں ابھی تک اس رائے پر قائم ہوں جو میں نے مسودہ ترتیب دینے والی مجلس کے پہلے اجلاس میں پیش کی تھی۔ یعنی آل انڈیا مسلم لیگ کو صوبائی خود اختیاری کا مطالبہ پیش کرنا چاہیئے (اور میرے خیال میں تمام مسلمانان پنجاب کی یہی رائے ہے) لہٰذا مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کا معتمد نہ رہنا چاہیئے۔ از راہ کرم میرا استعفاء قبول فرمایئے۔"

(۲)

مسلم لیگ کی صدارت

لیکن مسلم لیگ سے اقبال کی یہ جدائی مستقل نہ تھی، عارضی تھی۔ ان کے اندر

مسلم لیگ کے نصب العین میں بڑی حد تک ہم آہنگی تھی، اقبال کو مسلم لیگ سے اچھا پلیٹ فارم نہیں مل سکتا تھا۔ اور مسلم لیگ کو اقبال سے بہتر زعیم نہیں مل سکتا تھا۔ چنانچہ بہت جلد دونوں کے اختلافات رفع ہو گئے اور اقبال مسلم لیگ میں پھر واپس آ گئے اور ۱۹۳۰ء کے سیشن کے صدرِ اجلاس منتخب کر لئے گئے۔ یہ اجلاس الٰہ آباد میں ۲۹ دسمبر کو منعقد ہوا تھا۔

(۳)

خُطبۂ صدارت

اس اجلاس میں اقبال نے جو خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا، وہ علمیت، معنویت، افادیت، اہمیت، بالغ نظری، وسعتِ خیال، جدتِ افکار اور عالمانہ ومجتہدانہ صلاحیت کا مظہر اتم ہے۔ نہ صرف مسلم لیگ کی تاریخ میں بلکہ سیاست ہند کی تاریخ میں یہ خطبہ ایک امتیازِ خاص کا حامل ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی تفصیل اور جامعیت کے ساتھ ہندوستان کے حالات، مسلمانوں کی مشکلات، اسلام اور سیاست، مسلمان اور وطنیت، مسلمانانِ ہند کے مستقبل اور سیاسیات ہند کے انقلاب و تغیر کا جائزہ لیا ہے اور اس خوبی اور دل آویزی کے ساتھ کہ

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

تمام خطبات صدارت کے مقابلہ میں یہ خطبہ بہت طویل ہے اور جن مباحث کا یہ حامل ہے ان کے پیش نظر اس کی زیادہ سے زیادہ طوالت بھی جائز اور برمحل قرار دی جا سکتی ہے۔ ہم اس خطبہ کے چند خاص مباحث کا خلاصہ اپنی طرف سے

ضروری تشریح و تفسیر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(۳۴)

مسلمان اور اُس کا مذہب

اقبال نے بتایا ہے کہ "مسلمان اور اس کا مذہب" دوسری قوموں اور ان کے مذاہب کے مقابلہ میں کس فرق و امتیاز کا حامل ہے؟ کہ بغیر اس مسئلہ پر روشنی ڈالے وہ بات نہیں کہی جاسکتی ہے جسے وہ خاص طور پر کہنا چاہتے ہیں۔

"جس دینی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تبدیل کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اقوام و ملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنھوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔ یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود صرف عقیدۂ وطنیت کے ماتحت ممکن ہے۔ اس سے اہل مغرب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست، اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں

جس کو ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہئیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ رُوح کی اُس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیدِ مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔

بہر حال دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں۔ اس لیے اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنۂ متوسطہ کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو۔ اور جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیشِ نظر ایک ایسا عالمگیر نظامِ سیاست ہے جس کی اساس وحی پر ہے۔!"

(۵)

اسلام ایک زندہ قوّت ہے!

اقبال اس کے قائل نہیں تھے کہ "قیصر کا حق قیصر کو اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو" اقبال جس مذہب کے پیرو تھے اس کی حکومت فرد پر اور جماعت پر، داعی پر اور رعایا پر، پیر پر اور مرید پر، خانقاہ پر اور ایوانِ حکومت پر یکساں ہے اس کی حد سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ وہ محدود قومیت کا مخالف ہے۔ انسانی برادری کا قائل ہے۔ اسلام ایک ایسا نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے جس کی حکمرانی فکر و عمل کے ہر گوشہ پر ہے۔ اس بات کو اپنے مخصوص اور دل نشین انداز میں بیان کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

"اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن

کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔"

"آپ یہ خیال نہ فرمایئے گا کہ جس مسئلہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستورِ حیات اور نظامِ عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز اور نمایاں تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلاء و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج اُسے درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔"

(۶)

کیا مذہب ایک نجی اور ذاتی سوال ہے؟

عہدِ حاضر کی دنیا تو اس عقیدہ پر مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہے کہ مذہب انسان کا پرائیویٹ معاملہ ہے وہ جانے اور اس کا خدا کسی حالت میں بھی مذہب کو ایوانِ سیاست میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن اقبال

کہتے ہیں :

"سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے ؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے ؟ اور آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کے بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا ؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ بہ اعتبار آبادی ہم لوگ اقلیت میں ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے۔

لیکن آں حضرتؐ کی واردات مذہب کی حیثیت، جیسا کہ قرآن پاک میں ہیں اُن کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ محض حیات نوع کی واردات نہیں جن کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرونِ ذات سے ہو اور اس سے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ بر عکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے۔ اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی

تصورات مضمر تھے۔ اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کے منافی ہو۔"

(۷)

مسلمان کیا چاہتے ہیں ؟

یہ بات تو صاف ہو گئی کہ مسلمان کسی حالت میں بھی اپنے مذہب سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو مذہب کی عینک لگا کر دیکھیں گے۔ لیکن ان کا یہ اقدام کیا واقعی، دوسروں کے لئے جائز طور پہ وجہ شکایت بن سکتا ہے ؟ کیا اس اصول اور عقیدہ پر قائم رہ کر مسلمان اپنے یا دوسروں کے نقصان کا سبب بنتے ہیں ؟ اقبال اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ وہ صاف اور پختہ الفاظ میں بغیر کسی جھجک کے اعلان کرتے ہیں :-

"جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائدار تصفیہ کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی

روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے کبھی دریغ نہ کریں گے۔"

"یہ اصول کہ ہر فرد اور جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔ فرقہ واری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ واری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ بلکہ بہ حیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضار ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اس کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے ازسرنو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے! نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واری کے اس پہلو کا اعتراف کیا ہے۔"

علیحدگی سندھ پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے :-

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطۂ نظر کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبہ کا قیام مناسب نہیں بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کے گرم سے گرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر (اور یاد رکھیے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ واری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں) ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا ناممکن ہے"۔

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشو و نما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔

(۸)

پاکستان کا تصوّر:

"ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان"

ہندوستان میں ایک اسلامی ہند" کا تصور اسی موقع پر اقبال کے ذہن میں پیدا ہوا۔ شروع میں اس کا مذاق اڑایا گیا۔ لیکن بہت جلد یہ سوال مسلمانانِ ہند کی موت و زیست کا سوال بن گیا اور مسلمانوں نے طے کر لیا کہ ہر قیمت پر وہ پاکستان حاصل کر کے رہیں گے۔

گفتند جہان ما آیا بہ تو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ برہم زن

اقبال کہتے ہیں:-

"مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال وافعال میں وہ احساس پیدا نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے، پس یہ امر کسی طرح مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔ میری رائے میں مختلف ملتوں کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لا سکیں۔"

"ذاتی طور پر میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔ قسمت بنگال یا اس قسم

کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں بھی اور کمی ہو جائے گی۔ پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیئے نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ اس طرح نہ صرف ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ خود اس سے مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبۂ حب الوطنی بڑھ جائے گا۔"

"اگر شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشوو ارتقا میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صد ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فی صد ہے اور اگر عساکر ہند کی کُل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی تعداد ۶۲ فی صدی ہو جائے گی۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا بہ آسانی اندازہ کر سکتے ہیں جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی

بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتی ہیں ۔"

(۹)

اسلام کلیسائی نظام نہیں

چونکہ اسلامی حکومت کا نام سنتے ہی ہندوستان کی عظیم و جلیل اکثریت اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو جایا کرتی تھی، اقبال نے مدلل اور معقول طور پر ان اندیشوں کو رفع کرنے کی کوشش کی اور بتایا :۔

"ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہے۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں، بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے، جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک زندہ جز کی حیثیت سے چند فرائض و حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس افتتاحیہ سے کیا جا سکتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست کا فرض یہ تھا کہ سود کے متعلق قوانین بنائے۔ اسلام میں سود لینا حرام

ہے۔ میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح اور بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت اور اس کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا!"

(۱۰)

صوبوں کی نئی تقسیم

اقبال صرف پاکستان ہی کے محرک نہیں تھے وہ ہندوستانی صوبوں کی تقسیم جدید کے بھی داعی تھے۔ ان کا خیال تھا اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ خیال صحیح تھا کہ اس طرح ہندوستان کے وہ تمام مسائل خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو جائیں گے جو اس وقت فتنہ و فساد اور خون ریزی و ہنگامہ آرائی کا سبب بڑی آسانی سے بن جاتے ہیں۔ اس طرح اقلیت اور اکثریت کا سوال ختم ہو جائے گا۔ مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے گا۔ وہ داخلی مشکلات جو ملک کی ترقی اور عروج کے راستہ میں حائل ہیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ وہ فرماتے ہیں:

"ہندوستان کے لسانی اور عقائد و معاشرت کے بے شمار اختلافات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر فیڈریشن کا جو تصور قائم کیا گیا ہے اس کے ماتحت بھی ضروری ہے کہ مرکزی مجلس وضع قوانین کا انتخاب عوام کے ذریعہ عمل میں نہ آئے بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں

کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ سائمن رپورٹ کی رو سے تقریباً ان ہی اصولوں کی بنا پر جن کا اظہار میں نے کیا ہے صوبوں کی تقسیم بھی از سرِ نو ہونی چاہیئے۔ یہ بھی عرض کروں گا کہ صوبوں کی جدید تقسیم سے بیشتر دو شرطوں کا پورا ہو جانا ضروری ہے۔ اولاً یہ تقسیم نئے دستور کے اجراء سے پہلے مکمل ہو جانی چاہیئے۔ ثانیاً اس کی نوعیت ایسی ہو کہ اس سے فرقہ وارانہ مسائل ہمیشہ کے لیئے طے ہو جائیں۔

اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہو گی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا میری رائے میں اس سارے جھگڑے کی بنیاد صوبوں کی موجودہ تقسیم پر ہے ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخاب کا اصول قومیت کے منافی ہے ان کے نزدیک لفظ قومیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ لیکن ہم اس کے آرزومند نہیں۔ ہندوستان میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر مسلمانوں کی معاشی پستی، ان کی بے حد مقروضیت (بالخصوص پنجاب میں) اور بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا خیال کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے لیئے کیوں مضطرب ہیں۔ ہندوستان ایسے ملک میں اور خاص طور سے ان حالات میں جو اس وقت یہاں درپیش ہیں اس امر کی توقع رکھنا کہ علاقہ وارانہ انتخابات سے ہر ملت کے مفاد کی پوری پوری نمائندگی

ہو سکے گی ناممکن ہے۔ سوائے اس کے کہ تمام اقلیتوں پر ہندوؤں کا غلبہ قائم ہو جائے۔ لیکن اگر صوبوں کی تقسیم کسی ایسے اصول کے ماتحت عمل میں آجائے کہ ہر صوبے کے اندر تقریباً ایک ہی طرح کی ملتیں بستی ہوں اور ان کی نسل ان کی زبان ان کا مذہب اور ان کی تہذیب و تمدن ایک ہو تو مسلمانوں کو مخلوط انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ !"

(۱۱)

ہندوستان کا برّی اور بحری تحفظ

سر جان سائمن نے سائمن کمیشن رپورٹ میں کئی ایسی باتیں لکھی تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین غلط فہمی، ناگواری اور تلخی کا سبب بن سکتی تھیں۔ سائمن کمیشن رپورٹ اور اس کے مزعومات پر ایک عالمانہ نظر ڈالنے کے بعد علامہ اقبال نے بڑے پتہ کی بات کہی :-

"ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی برّی سرحدوں کو تو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ لیکن اس کے بحری تحفظ کے متعلق صرف سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں۔ لیکن یہ امر بھی مسلّم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ

حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر فیڈرل ریاست وجود میں آئے گی تو مسلم فیڈرل ریاستیں ہندوستان کے تحفظ کی خاطر ایک غیر جانب دار ہندوستانی فوج کے قیام کے لیے جو خشکی اور سمندر دونوں پر متعین ہو ہر قسم کی مدد دینے پر آمادہ ہوں گی۔ مغلوں کے زمانے میں اس قسم کے غیر جانب دار عساکر واقعۃً موجود تھے۔ بلکہ اکبر کے زمانے میں تو ان تمام سرحدی افواج کے افسر ہندو ہی تھے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیڈرل نظامِ حکومت میں ایک غیر جانب دارانہ ہندوستانی لشکر قائم ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذباتِ حب الوطنی اور زیادہ قوی ہو جائیں گے۔ اور اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ اگر باہر سے حملہ ہوا تو مسلمانانِ ہندوستان اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مل جائیں گے۔"

(۱۲)

گلۂ جفائے وفا نما

عین اس وقت جب برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کے آئینی مسائل حل کرنے کی کوشش کا آغاز ہو چکا تھا اور مسلمان اپنی ملّی انفرادیت کے تحفظ اور بقا کے لئے سرگرمِ عمل ہو رہے تھے خود مسلمانوں ہی میں کچھ ارباب ہمم ایسے پیدا ہو گئے تھے جو ان مساعی جمیلہ پر پانی پھیر دینا چاہتے تھے ان میں ایک جماعت تو وہ تھی، جو نام نہاد نیشنلسٹ مسلمانوں پر مشتمل تھی اور لکھنؤ میں اپنے اجتماعات منعقد کر رہی تھی دوسرا گروہ وہ تھا جس کا مرکز

پنجاب تھا اور جو مسلمانوں سے زیادہ اپنے مستقبل کے تحفظ کیلئے ساعی تھا۔ اقبال نے اس موقعہ پر ان دونوں جماعتوں کو ٹوکا اور حکومت کو بھی۔

"میں نے مختصراً اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ ہندوستان کے آئینی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے ہمارا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل کے مستقل تصفیے کے لئے برطانوی ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم از سر نو ہو جائے لیکن اگر مسلمانوں کا مطالبہ مسترد کر دیا جائے تو پھر میں نہایت شد ومد کے ساتھ ان مطالبات کی تائید کروں گا جن کا اعلان آل انڈیا مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ میں بار بار کیا گیا ہے مسلمانان ہندوستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں جس کے تحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخاب کے ذریعے اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں۔ یا مرکزی مجلس میں انہیں ۳۳ فی صد نشستیں نہ مل جائیں۔ اب تک مسلمانوں کے سیاسی رہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔ پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے جسے قومیت ہند کے غلط تصور پر مرتب کیا گیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمان ان تمام مواقع سے محروم رہ جاتے ہیں کہ وہ اس ملک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں۔ دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد و اتفاق کی وہ ناعاقبت اندیشانہ قربانی ہے جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا ہے جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے لیکن مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق اور تجویز دونوں کی مذمت کرے!"

(۱۳)

نیا جال لائے پرانے شکاری

پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی معمولی تھی۔ کہ وہ معمولی سی کوشش کے بعد بے اثر بنائی جا سکتی تھی اور انڈیا ایکٹ (۱۹۳۶ء) کے نفاذ کے بعد ہم نے دیکھ لیا کہ ایسا ہوا بھی۔ صوبہ سرحد اور سندھ میں مسلمان غیر معمولی اکثریت کے حامل تھے۔ لیکن انگریزوں نے سندھ کو بمبئی سے ملحق کر کے اس کا دم چھلا بنا دیا تھا۔ اور سرحد کو سرزمین بے آئین بنا رکھا تھا جہاں نہ کونسل تھی نہ اسمبلی۔ چیف کمشنر وہاں کا غیر مسئول فرماں روا تھا۔

مسلمانوں نے جب یہ مطالبہ کیا کہ سندھ اور سرحد کو امساوی اصلاحات سیاسی سے بہرہ ور کیا جائے تو ہندوؤں نے ا اور ہندوؤں کا کیا ذکر کانگریس جیسے "بین الاقوامی" ادارہ تک نے کھلے بندوں بغیر کسی جھجک اور تامل کے سندھ اور سرحد کو سیاسی اصلاحات دینے کی مخالفت کی۔

اب سائمن کمیشن رپورٹ کے بعد ہندوستان کو اصلاحات سیاسی کی نئی قسط ملنے والی تھی اور ہندوؤں کی طرف سے کہا جا رہا تھا کہ سندھ غریب اپنا بار نہیں اٹھا سکے گا۔ سرحد کے لوگ وحشی اور خون آشام ہیں لہٰذا وہ اصلاحات سیاسی کے مستحق نہیں۔ مقصد یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کی اکثریت کو غیر موثر بنا دیا جائے۔ اور سرحد و سندھ کی واضح اکثریت کو بروئے کار آنے کا موقع نہ دیا جائے۔

اقبال نے یہ حقیقت بھولی تھی کہ سندھ اور سرحد کو جب تک صوبائی

درجہ مساوی طور پر یعنی دوسرے صوبوں کے برابر نہیں عطا کیا جائے گا اِس ملک میں مسلمان کسی طرح کی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :-

"مسلمانانِ ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہوگا جس کے ماتحت سندھ کو بھی ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبے کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہل سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن، عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ دان مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اس باہمی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ "سندھ وہ ملک ہے جو ممالکِ اسلامی سے قریب تر ہے"۔ سب سے پہلے اموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور منہ عرب کی جانب، مناسب رد و بدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف ہے اور منہ مشرق وسطیٰ کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان زراعتی مسائل کا جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں، اور اس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے (اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دار السلطنت بن جائے گا) تو صاف نظر آتا ہے کہ اس کو احاطہ بمبئی سے ملحق

رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر بعید ہے؟ بے شک اس وقت بمبئی کا رویہ دوستانہ ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ کل ہی وہ اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکومت ہند اس امید افزا صوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔ رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ سو یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات سب کمیٹی سے بھی کم ہیں اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لیے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ پٹھانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی یہ دلیل کسی قدر لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی۔ اور ہمارا فرض ہے کہ ہم تمام انسانوں کو یہ روشنی پہنچائیں خواہ وہ بارود خانے میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔ پٹھان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو اُن کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو

مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ گذشتہ ایام میں اس بدقسمت صوبہ میں جو المناک واقعات پیش آچکے ہیں وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندوستان میں اصول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لے کر اب تک اس سے رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے۔ اور وہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھیں گے کہ اس صوبہ میں جو کچھ پیش آرہا ہے خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند نے اپنی یادداشت میں صوبہ سرحد کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے وہ ناکافی ہیں بے شک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی تجویز کی گئی ہے۔ لیکن حکومت ہند نے بھی اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے حالانکہ پٹھان اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری اداروں میں حصہ لیں۔“

(۱۴)

گول میز کانفرنس

۱۹۳۰ء کا نگریس کی سول نافرمانیوں سے ڈر کر حکومت برطانیہ نے لندن میں ایک گول میز کانفرنس منعقد کی تھی جس کے اجلاس پیہم ہو رہے تھے۔ اس کانفرنس کے داعی اور صدر اعلیٰ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ تھے جو ہمیشہ سے ہند پرست تھے۔ اور

مولانا محمد علی مرحوم نے جن کا نام ہی ریمزے میکڈانلڈ کی بجائے "رامجی مکندامل" رکھ دیا دیا تھا۔ اور یہ وزیر اعظم صاحب پارلیمنٹ کے تازہ اجلاس میں بہ واضح الفاظ مسلمانوں سے جداگانہ انتخاب تک چھیننے پر تیار ہوگئے تھے کیونکہ یہ مغربی جمہوریت کے منافی تھے۔

اقبال نے سمجھ لیا تھا کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے؟ انہوں نے بالکل صحیح موقعہ پر جذبات سے نہیں دلیل سے کام لے کر انگریزوں کی رہنمائی بھی کی ہندوؤں کی بھی، اور مسلمانوں کی بھی۔ انہوں نے انگریزوں کو بتایا کہ مغربی جمہوریت اس مجموعہ اقوام (بھارت) کے روگ کا علاج نہیں۔ ہندوؤں کو بتایا کہ تم مسلمانوں کو اپنی قومیت میں جذب کر لینا چاہتے ہو لیکن حالت یہ ہے کہ تم خود ایک قوم نہیں ہو اور مسلمانوں سے کہا ؎

کیوں گرفتارِ طلسم ہیچ مقداری ہے تو
دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے

انہوں نے فرمایا :-

"ذاتی طور پر مجھے اس کانفرنس سے کوئی امید وابستہ نہیں البتہ یہ ضرور تصور کیا جاتا ہے کہ فرقہ وارانہ رزمگاہ میں اور ایک بدلی ہوئی فضا میں کہیں زیادہ ہوشمندی سے کام لیا جائے گا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ واقعات بالکل اس کے برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر جو بحث لندن میں ہوئی ہے اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ وزیر اعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہے کہ ہندوستان میں یہ مسئلہ بین الاقوامی ہے انہوں نے کہا ہے "یہ ایک دشوار بات ہوگی کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کی تجاویز پیش کرے

اس لئے کہ مخلوط انتخابات انگریزی جذبات جمہوریت پسندی کے زیادہ قریب ہیں!!" انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ ایک ایسے ملک میں، جہاں متعدد قومیں آباد ہیں برطانوی جمہوریت کی صورت قائم نہیں ہو سکتی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس مسئلے کو جغرافیائی اصول پر حل کیا جائے۔ جداگانہ انتخابات کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر پہنچے گی۔ آخر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمائندے اس مسئلے کو محض سطحی نظروں سے نہیں دیکھیں گے۔ جیسا کہ اب تک ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے۔ بلکہ ان کی نگاہیں اس معاملہ کی تہ تک پہنچ جائیں گی اور وہ محسوس کریں گے کہ ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا کیا ہے؛ بلکہ اُن کی نگاہیں اس معاملہ کی تہ تک پہنچ جائیں گی اور وہ محسوس کریں گے کہ ہندوستان کے اندر امن و سکون کے قیام کا طریق کیا ہے؟ ہر وہ دستور جو اس تصور پر مبنی ہو گا کہ ہندوستان میں ایک ہی قوم بستی ہے یا جس کا مقصد یہ ہو کہ یہاں ان اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبات جمہوریت پسندی کا نتیجہ ہیں اس کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کو نادانستہ طور پر خانہ جنگی کے لئے تیار کیا جائے۔ جہاں تک میری سمجھ کام کرتی ہے اس وقت تک امن و سکون قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس امر کو تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان کی ہر ملت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں پر آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان ہندو بین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے کسی مسلمان سیاسی راہنما کو اس طعن آمیز لفظ یعنی "فرقہ داری" کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیئے جسے ہندو محض پروپیگنڈے کی خاطر استعمال کرتے ہیں تاکہ بقول وزیر اعظم وہ انگلستان کے جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھا سکیں اور اگر انگریز ہندوستان میں ایک ایسی صورتِ حالات فرض کر لیں جو واقعتہً موجود نہیں۔ اس وقت بڑے بڑے مفاد خطرے میں پڑے ہیں۔ لیکن ہماری تعداد سات کروڑ ہے اور ہم ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یک رنگ قوم ہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ صرف مسلمان ہی ہے۔ اگرچہ ہندو بہت سی باتوں میں ہم سے آگے ہیں۔ لیکن اب بھی ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لئے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بے شک ہندو اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان رہنماؤں اور ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے متاثر نہیں ہونا

چاہیئے کہ ترکی، ایران اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانانِ ہندوستان کی حالت اس سے مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے۔ اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق باصطلاحِ قرآنی اہلِ کتاب سے ہے۔ مسلمان اور اہلِ کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی، عیسائی یا زردشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھوئے تو وہ نجس نہیں ہوتا۔ شریعتِ اسلامی کی رُو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اولین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحادِ نوعِ انسان کی خاطر اٹھایا۔ اس نے ان لوگوں کو جن کا سیاسی نصب العین تقریباً ایک سا تھا باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ (یعنی توحید) سوآءٍ بیننا و بینکم الخ۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کی باہمی جنگ و جدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقع نہیں دیا کہ دنیائے اسلام اس آیت کے لاانتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہرحال آج بلادِ اسلامیہ میں یہ مقصد اسلامی قومیت کی شکل میں پورا ہو رہا ہے!"

کیا یہ باتیں حکیم الامت کے سوا کوئی اور بھی کہہ سکتا تھا؟ ان ارشادات میں بصیرت بھی ہے، اور فراست بھی، اسلامیت بھی اور ملیت بھی!۔

(۱۵)

اقبال پر جواہر لال کی تنقید

اقبال نے حکومت برطانیہ کے سامنے ہندو اکثریت کے سامنے اور مسلمانان ہند کے سامنے جو چیز پیش کی وہ یہ تھی:

۱) تقسیم ہند ـــ یعنی ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کا قیام۔

۲) اگر فی الحال یہ ممکن نہ ہو تو پھر

(الف) جداگانہ انتخاب (ب) مرکز میں مسلمانوں کی ۳۳ فی صد نمائندگی

(ج) تہذیبی اور ثقافتی آزادی۔

اقبال کی ان باتوں کا مذاق اڑایا گیا۔ انہیں ناقابل اعتنا قرار دیا گیا۔ ہندو اخبارات نے عام اس سے کہ وہ اردو کے ہوں یا انگریزی کے، رکیک اور مبتذل انداز میں اقبال پر نکتہ چینی کی۔ انہیں ملک کا غدّار اور سیاست نا آشنا لیڈر قرار دیا۔

ساری ہندو دنیا میں ایک جواہر لال کی ہستی ایسی تھی جس کی بے تعصبی، فراخ دلی، رواداری، اور ہندو مسلم مسئلہ سے بلند و برتر حیثیت کا اعتراف خود مسلمانوں کی ایک بہت بڑی اور غیر کانگریسی جماعت تک کو تھا۔ لیکن جواہر لال نے بھی اقبال کے ان تصورات پر جب نکتہ چینی کی تو ہوش و حواس کھو بیٹھے اور دلیل اور منطق سے بے نیاز ہو گئے۔ وہ حقیقت اور واقعہ کو نظر انداز کرنے پر تل گئے۔ خالص ہندو بن کر انہوں نے نکتہ چینی کی۔ اور ستم یہ کہ جواہر لال نے اپنے خیالات کا اظہار کسی مضمون یا مقالہ میں نہیں کیا۔ ایسا کرتے تو ہم خیال کرتے کہ یہ دقیق اور سطحی چیز ہے روا روی میں ایک بات کہہ گئے ہیں انہوں نے ان خیالات

کا اظہار اپنی مشہور تاریخی کتاب "تلاشِ ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں کیا ہے جسے انھوں نے جیل کی تنہائی میں کامل اطمینان اور یکسوئی کی حالت میں تمام معاندانہ اور رقیبانہ و حریفانہ جذبات و کشمکش سے خالی الذہن ہو کر تحریر فرمایا ہے۔ کتاب کی سنجیدگی اور اہمیت اور تاریخی مباحث کے استناد کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں اُسے باقاعدہ شریک کیا گیا۔

آیئے اب ہم دیکھیں جواہر لال اقبال کے خیالات و تصورات کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟:-

تقسیمِ ہند کے تخیّل پر برہمی

اقبال کے نظریۂ تقسیمِ ہند پر جواہر لال کی گل افشانیٔ گفتار ملاحظہ ہو:-

"اب سے چند سال پہلے تقسیمِ ہند کی آواز بلند ہوئی۔ یوں تو اس کے بہت سے اصلی اور ضمنی اسباب تھے۔ فریقین کی بہت سی غلطیاں اور حماقتیں تھیں، اور سب سے بڑھ کر حکومت برطانیہ کی تفریقی پالیسی تھی۔ لیکن ان سب کی تہ میں یہ نفسیاتی کیفیت تھی جو علاوہ اور تاریخی اسباب کے اس وجہ سے پیدا ہوئی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے متوسط طبقے کی نشو و نما بہت دیر میں ہوئی۔ آج ہمارے ملک میں جو اندرونی کشمکش نظر آتی ہے وہ صرف قومی تحریک اور غیر ملکی حکومت ہی میں نہیں بلکہ جاگیری نظام اور جدید تصورات و ادارات میں بھی ہے۔

یہ کشمکش مجموعی طور پر پوری قوم میں نظر آتی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسری بڑی بڑی جماعتوں کے اندر بھی، قومی تحریک جس کی نمائندگی نیشنل کانگریس کرتی ہے یقیناً جدید تصورات اور واردات کی نشو و نما کے تاریخی عمل کی علمبردار ہے۔ اگرچہ وہ ان تصورات

کو بعض قدیم اصولوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے اس وجہ سے اس میں ہر قسم کے لوگ جو آپس میں شدید اختلاف رکھتے ہیں جمع ہو گئے ہیں ہندوؤں میں ایک تنگ اور بے لوچ سماجی نظام نے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور دوسری جماعتوں کو بھی پھڑکا دیا۔ مگر اب خود اس سماجی نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اس میں وہ سختی نہیں رہی۔ بہر حال اس نظام میں اتنی قوت نہیں کہ وہ قومی تحریک میں جو وسیع معنی میں ہر قسم کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں پر حاوی ہے روڑا اٹکا سکے اب قومی تحریک میں اتنا زور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ ہر قسم کی رکاوٹوں کے باوجود آگے بڑھتی رہی ہے۔ مسلمانوں میں جاگیری عناصر بدستور طاقتور ہیں اور عام طور پر انہیں عوام سے اپنی قیادت کے منوانے میں کامیابی ہوتی رہی ہے۔ ہندو متوسط طبقے اور مسلمان متوسط طبقے کی نشوونما میں ایک نسل سے زیادہ کا فرق رہا ہے۔ اور یہ فرق اب تک سیاست معیشت اور دوسرے شعبوں میں نمایاں ہے اس پس ماندگی نے مسلمانوں میں خوف کی نفسیاتی کیفیت پیدا کر دی ہے۔

پاکستان یعنی ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز خواہ وہ جذباتی حیثیت سے کتنی ہی کشش کیوں نہ رکھتی ہو اس پسماندگی کا علاج نہیں ہے بلکہ یہ اندیشہ ہے کہ اس سے جاگیردار طبقے کو اور تقویت پہنچے گی اور مسلمانوں کی معاشی ترقی میں تاخیر ہو گی"۔

جواہر لال کی اس بے دردانہ تنقید میں کوئی وزن ہے؟ کوئی دلیل ہے؟ کوئی اپنایت ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے ایک عقیل و فہیم انسان چند بے وقوفوں کی غلط کاریوں پر بڑی اونچائی سے لعن طعن کر رہا ہے۔ نہ مرض کی تشخیص ہے نہ اس کا علاج نہ مداوائے مرض کی تدبیر!

مُسلم کانفرنس

بیا ساقی نقاب از رُخ برافگن!
چکید از چشمِ من خُونِ دلِ من!
بہ آں لحنے کہ نے شرقی نہ غربی است
نوائے از مقامِ لاتخف زن!

(۱)

سیاستِ ہند کا نیا دور

سیاست کے خارزار میں اقبال نے جب قدم رکھا تو سیاسیات ہند کا ایک نیا دور شروع ہو چکا تھا۔

(۱) گاندھی جی نے "آزادی ہند" کے لئے بار بار سول نافرمانی کی تحریک شروع کی ہر شکست ان کے سمند عزم پر تازیانہ کا کام کرتی تھی وہ اس زمانہ میں سول نافرمانی کی متعدد اور متنوع قسموں کا تجربہ کر رہے تھے۔

الف - اجتماعی سول نافرمانی سول نافرمانی کی وہ قسم تھی، جسے گاندھی جی۔ اس وقت عمل میں لاتے تھے، جب دیکھتے تھے کہ لوہا گرم ہے چوٹ لگانے کی دیر ہے، کسی عوامی مسئلہ کو ابھارا اور سول نافرمانی شروع کر دی۔

ب انفرادی سول نافرمانی اجتماعی سول نافرمانی کا مقابلہ حکومت سختی سے کرتی تھی۔ سول نافرمانی کی تحریک کتنی ہی پرامن ہو، لیکن "عوام" کی شرکت اس میں کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی حد تک تشدد کا رنگ پیدا کر دیتی تھی اور جہاں تشدد کی جھلک حکومت نے دیکھی وہ پوری

قہرمانیت کے ساتھ کچلنے پر تیار ہو جاتی تھی، قاعدہ ہے کہ بڑے تشدد کے سامنے چھوٹا تشدد نہیں ٹھہر سکتا، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بہت جلد تحریک افسردہ ہو جاتی تھی اور عوام بے دل ہو جاتے تھے، ایسے موقع پر گاندھی جی عام سول نافرمانی بند کر دینے کا اعلان کر دیتے تھے۔ البتہ اپنے منتخب اور چیدہ لوگوں کو سول نافرمانی کی اجازت دیتے تھے تاکہ عوام کا جذبۂ ایثار بیدار رہے اور،

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ!

منتخب اور چیدہ آدمی بہرحال محدود ہوتے تھے، ان کے داخل زنداں ہونے کے بعد فضا پر سناٹا چھا جاتا تھا۔

ج شخصی سول نافرمانی انفرادی سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی تن تنہا میدان کارزار کا رُخ کرتے تھے اور قانون شکنی کر کے جیل چلے جاتے تھے۔

(۲) کئی سال سے یہ سلسلہ جاری تھا، حکومت سے اور کانگریس سے گاندھی جی سے اور وائسرائے سے بار بار لڑائی ہوتی تھی، اور صلح ہوتی تھی، آخر حکومت نے "گول میز کانفرنس" کا اعلان کیا، تاکہ آزادیٔ ہند کا مسئلہ طے کیا جائے، پہلی گول میز کانفرنس (۱۹۳۰) میں کانگریس شریک نہیں ہوئی، مولانا محمد علی نے اسی کانفرنس میں ایک یادگار تقریر کر کے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کر دی تھی، دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱) میں گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اقبال بھی پہلی گول میز کانفرنس میں مدعو نہیں کئے گئے تھے۔ لیکن دوسری میں سر فضل حسین نے وائسرائے سے لڑ کر اقبال کو بھجوایا۔ اس کانفرنس کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوئے، سیاستِ ہند کا آخری اور فیصلہ کن دور یہیں سے شروع ہوا۔

(۳) مسلمان سخت ذہنی کشمکش میں تھے، ان کا نوجوان طبقہ اور نیشنلسٹ گروہ غیر مشروط طور پر، کانگریس کا ساتھ دینے پر تلا ہوا تھا، وہ کہتا تھا، پہلے آزادی پھر حقوق کا تصفیہ اور ذرا نہیں سوچتا تھا کہ یہ اقدام اور طرزِ فکر قومی خودکشی کے مترادف ہے، اور نہ کوئی اُسے سمجھانے اور راہِ راست پر لانے والا تھا، کیونکہ مسلمان لیڈر، اپنی بے عملی کی وجہ سے بے اثر ہو چکے تھے، مسلمان سیاسی جماعتیں آپس کے جھگڑوں میں مصروف تھیں، مسلمانوں کے اس افتراق و انتشار سے، انگریز اور ہندو برابر کا فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ان حالات میں، چند درد مند مسلمانوں نے "مسلم کانفرنس" کے نام سے آغا خاں کے زیر صدارت، ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی، جو، مختلف الفکر اور مختلف الرّائے مسلمانوں کا بہت جلد مرکز بن گئی، اس کے اسٹیج پر اگر ایک طرف علی برادران نظر آتے تھے، تو مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی بھی دکھائی دیتے تھے۔ یہاں اگر سر شفیع جیسا ہوا خواہ سرکار تھا، تو حسرت موہانی جیسا منچلا، انقلابی بھی، ــــــ اور اقبال جیسا حکیم الامّت اور شاعرِ مشرق بھی!

آغا خاں نے عملی حصہ نہیں لیا، خطبۂ صدارت پڑھ کر چلے گئے، مسلم کانفرنس کا بار بڑی حد تک اقبال کے دوشِ ناتواں پر رہا، کچھ عرصہ بعد وہی اس کے صدر بھی ہو گئے۔ مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اقبال نے بڑی گراں بہا خدمات انجام دیں اور مسلمانوں کو ہندو استیلا اور استعمارِ فرنگ سے بچانے کی خاطر اپنی صحّت تک خطرہ میں ڈال دی۔

سیاسیاتِ ہند کا جو پس منظر ہم نے ابھی بیان کیا ہے، اسے پیشِ نظر رکھّے بغیر اقبال کی سیاسی جد و جہد اور ان کی سیاسی فراست و بصیرت کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا، اب ہم اصل موضوع پر آتے ہیں:۔

(۲)

انگلستان اور ہندوستان

لیکن قبل اس کے کہ آگے بڑھیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلوم کر لیں کہ انگلستان اور ہندوستان نیز ہندو مسلم مسئلہ سے متعلق اقبال کا نقطہ نظر کیا تھا۔ سر فرانسس ینگ ہسبینڈ نے LIGHT IN THE STARS. میں جن خیالات کا اس موضوع پر اظہار کیا تھا، ان پر سول ملٹری گزٹ میں اقبال نے ایک دل آویز تبصرہ کیا، جس کا ایک خاص حصّہ یہ ہے۔

"میں اس دن کا منتظر ہوں، جب کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان اختلاف دور ہو جائیں گے اور دونوں ممالک نہ صرف اپنے لئے بلکہ بنی نوع انسان کی بہبودی کے لئے کوئی پروگرام بنائیں گے، ہم دونوں میں سے کسی کو بھی صورتِ حالات سے مایوس نہ ہونا چاہئے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف اس خیال سے مرعوب ہو کر کوئی کام کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔ کہ آج کل دونوں ممالک میں شدید اختلافات موجود ہیں لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں، میرا تو یہ خیال ہے کہ یہ اختلافات باہمی مطابقت کے دور کا لازمی نتیجہ ہیں۔ اور کسی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچائے بغیر دور ہو جائیں گے، بشرطیکہ ہم بھی ٹھنڈے دل سے کام لیں اور تنفر، غرور، تشدّد اور عدم رواداری کے جذبات پر قابو رکھیں۔ باہمی مطابقت کے ایسے دور تاریخ میں عام ہیں۔ یورپ کی تاریخ ان سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح مشرق و مغرب میں بھی یہی مطابقت اور موافقت ناگزیر ہے اگرچہ قدرتی طور پر اسے عملی جامہ پہنانے میں مقابلتاً زیادہ عرصہ

ٹمک گیا ہے!"

کوئی بڑے سے بڑا محبِ وطن بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ جچی تلی رائے اور کیا دے سکتا تھا، جو اقبال نے دی ہے۔!

(۳)

ہندو مُسلم مسئلہ

آگے چل کر، اقبال نے ہندو مسلم مسئلہ پر، جو وقت کا نازک ترین مسئلہ تھا، اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن ایک کٹر "فرقہ پرست" کی حیثیت سے نہیں، ایک شریف مسلمان اور ایک محبِّ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے:۔

"اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خود ہندوستانیوں میں باہمی مطابقت کی ضرورت ہے، اور جب تک ہم خانگی جھگڑے طے نہ کر لیں، ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا نہ سیکھ لیں، صحیح بین الاقوامی امن کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔

ہندوستان کے اندرونی جھگڑے اور اختلافات عالمگیر امن کے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہیں، لیکن موجودہ حالات کی نزاکت کے باوجود مجھے فرقہ وارانہ مفاہمت کے امکان کی قوی امید ہے۔

آج کل ہندوستانیوں کی سب سے بڑی ضرورت ہندو مسلم مسئلہ کا حل ہے اس مسئلہ کی نزاکت اور اہمیّت اور اس کے حل کرنے میں عملی مشکلات اور مصائب کے پیشِ نظر بھی، مجھے بہت سے ہندوستانیوں اور انگریزوں کے اس خیال سے

اختلاف ہے کہ ہندو مسلم سمجھوتہ ناممکن ہے اور اس ضمن میں تمام کوششیں رائیگاں جائیں گی۔ اور مجھے یہ کہنے سے بھی عار نہیں کہ اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے میں ہمیں برطانیہ کی امداد کی ضرورت ہوگی۔ بشرطیکہ اس کے اغراض نیک نیتی پر مبنی ہوں۔!"

اقبال کے ان خیالات میں جو توازن، سنجیدگی اور جذبۂ حب وطن نمایاں ہے۔ کیا وہ ان کے اخلاص کا ناقابل تردید ثبوت نہیں ہے؟

(۴)

مُسلماں کمیونزم کی آغوش میں

آگے چل کر، اقبال نے اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کیا ہے۔ انگریزوں کو ان کی چال بازیوں سے متنبہ کرنے کے بعد وہ ہندوؤں کے علم میں بھی یہ بات لاتے ہیں کہ۔

"آئندہ گول میز کانفرنس میں اگر برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، تو آخر کار یہ بات دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔ اگر برطانیہ اپنے کسی مادی مفاد کے پیش نظر ہندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور اسے برسر اقتدار رکھے، تو ہندوستان کے مسلمان اس بات پر مجبور ہوں گے کہ سوراجیہ یا اینگلو سوراجیہ نظام حکومت کے خلاف وہی حربہ استعمال کریں جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف کیا تھا۔ مزید برآں اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کے آغوش میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں اُن کے تفوق و اقتدار کو سخت دھکا لگے

میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی لوگ فطرتاً لامذہب نہیں ہیں، بلکہ میری رائے میں وہاں کے مرد اور عورتوں میں مذہبی میلان بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ روس کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معینہ عرصہ تک نہیں رہے گی، یہ اس لئے کہ کسی سوسائٹی کا انتظام دہریت کی بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا۔ حالات کے اپنے معمول پر آجانے کے بعد جونہی لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملے گا، انھیں یقینی طور پر اپنے نظام کے لئے کسی مثبت بنیاد کی تلاش کرنی ہوگی۔

اگر بالشیوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے، تو بالشیوزم اسلام کے بہت ہی قریب آجاتا ہے اس لئے میں متعجب نہ ہوں گا کہ اگر کسی زمانہ میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔ اس چیز کا انحصار زیادہ تر اس حیثیت پر ہوگا جو نئے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں کی ہوگی۔"

روسی کمیونزم، اسلام، اور مسلمانوں کے بارے میں اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ بات اگرچہ پرانی ہو چکی ہے لیکن قوموں اور ملتوں کی تقویم اتنی مختصر نہیں ہوتی جتنی امروز و فردا کی، لہذا، گو یہ بات پرانی ہو چکی، لیکن اس کا وقوع اور امکان بالکل ممکن ہے اور نہیں کہا جا سکتا، مستقبل اس سلسلہ میں کیا گل کھلائے گا؛

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا؟
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا؟

(۵)

ہندوؤں کے خلاف تعصب نہیں

آگے چل کر اقبال، ہندوؤں سے متعلق اپنے خیالات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے

فرماتے ہیں :-

"میرا مطلب یہ نہیں کہ ہندوؤں کے خلاف مجھے تعصب ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ان قربانیوں اور ہمّت کا جس کا انہوں نے پچھلے چند سالوں میں مظاہرہ کیا ہے دل سے مداح ہوں انھوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں ممتاز شخصیتیں پیدا کی ہیں، اور وہ بہت تیزی سے معاشرتی اور اقتصادی ترقّی کے راستہ پر گامزن ہیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر ہندو ہم پر حکومت کریں، بشرطیکہ ان میں حکومت کرنے کی اہلیت اور شعور ہو۔ میں نے مختصر طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کا نظریہ پیش کر دیا ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ہندو مسلم سمجھوتہ کے متعلق مایوس ہوں مجھے تو امیّد ہے کہ گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل ضرور مل جائے گا جس سے نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ انگریز بھی مطمئن ہو جائیں گے، ہمیں اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے حالات کا روشن پہلو لینا چاہیے اور بہترین نتائج کی خواہش معمولی نتائج کی توقع، اور بدترین نتائج کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

میں یہ سمجھ سکتا ہوں، کہ بعض لوگ یہ ضرور کہیں گے کہ اس قسم کی امیدیں رکھنا تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن نہ ختم ہونے والے جھگڑے اور فسادات، عدم تعاون اور سول نافرمانی۔ برطانوی حکومت کا تشدّد، بنگال کے انتہا پسندوں کی دہشت پسندی، اور کان پور کے (ہندو مسلم) بلوؤں کے پیش نظر اس قسم کی امیدیں غلط معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جمہوریت کے ساتھ جھگڑے اور فساد، لازم و ملزوم ہیں، اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ جمہوریت کامل سیاسی سکون کی ضامن ہے، تو دنیا کی تاریخ سے وہ بالکل ناواقف ہے

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے ؎

جمہوریت میں ایسی تمام خواہشات و شکایات کو پھر سے ابھرنے کا موقع ملتا ہے، جنھیں شخصی حکومت کے دور میں دبا دیا گیا ہو یا پورا نہ کیا گیا ہو، جمہوریت ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کی موجد ہوتی ہے، جو اکثر اوقات ناقابل عمل ہوتی ہیں یہ اختیار کا آسرا نہیں لیتی۔ بلکہ تقریروں، اخباروں اور پارلیمنٹ میں بحث و تمحیص سے قوت حاصل کرتی ہے اور بتدریج لوگوں کو کسی مسئلہ کے ایسے حل کو قبول کرنے پر تیار کر لیتی ہے، جو معیاری تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن حالات کے پیش نظر قابل عمل ہوتا ہے۔"

ہندو مسلم اتحاد سے متعلق جس امید کا اظہار کیا گیا ہے، جمہوریت کے بارے میں جن عالمانہ اور مبنی بر حقیقت خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، باہمی آویزش اور چپقلش کی تاریکی میں روشنی کی جس کرن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیا یہ سب باتیں اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت نہیں ہیں کہ اقبال کا دل واقعی ہر قسم کے تعصب سے خالی تھا، اور وہ سچے دل سے جمہوریت کے فروغ کے متمنی تھے، بشرطیکہ جمہوریت، وہ جمہوریت نہ ہو،

جس کے پردہ میں نہیں غیر از نوائے قیصری!

(۶)

اسلام ایک سوسائٹی ہے

۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو لاہور میں، مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ صدر اجلاس علامہ اقبال تھے۔ اس موقع پر انھوں نے، جو عالمانہ اور بصیرت افروز خطبہ صدارت

ارشاد فرمایا وہ مفہوم و معنی کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے، اس خطبہ میں انھوں نے سیاست ہند، سیاست بین الاقوام، سیاست عالم اسلام، اور وقت کے دوسرے بے حد اہم اور نازک مسائل پر بسط و تفصیل سے بحث کی ہے، ہم اپنے موضوع سے متعلق چند چیزیں اس خطبہ کی پیش کر کے، ان کے مالہ وما علیہ پر گفتگو کریں گے ۔

سب سے زیادہ زور، اقبال نے جس چیز پر دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مسلمان، اور اسلام کے مابین کس طرح کا رشتہ اور تعلق ہے ؟ ۔

"سیاسیات کی جڑ انسان کی روحانی زندگی میں واقع ہوتی ہے، میرا عقیدہ ہے کہ اسلام ذاتی رائے کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک سوسائٹی ہے یا پھر سوک چرچ (CIVIC CHURCH) سیاسیات سے میری دلچسپی بھی دراصل اسی وجہ سے ہے، آج کل ہندوستان کے اندر سیاسی تصورات جو شکل اختیار کر رہے ہیں، وہ آگے چل کر اسلام کی ابتدائی ساخت اور فطرت پر غالباً اثر انداز ہوں گے۔ میں یورپ کی وطنیت کا مخالف ہوں، اس لئے نہیں کہ اسے اگر ہندوستان میں نشو و نما پانے کا موقع ملے، تو مسلمانوں کو مادی فوائد کم ہوں گے، میری مخالفت تو اس بنا پر ہے کہ میں اس کے اندر ملحدانہ مادیت پرستی کے بیج دیکھتا ہوں، جو میرے نزدیک انسانیت کے لئے ایک عظیم ترین خطرہ ہے، حب الوطنی بالکل طبعی صفت ہے، اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کے لئے پوری جگہ ہے، لیکن اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب، اور اس کی روایات کو حاصل ہے اور میری نظر میں یہی اقدار اس قابل ہیں کہ انسان اُن کے لئے زندہ رہے، اور ان ہی کے لئے مرے، نہ زمین کے اس ٹکڑے کے لئے جس سے اس کی روح

کو کچھ عارضی ربط پیدا ہو گیا ہے!"

ان چند سطروں میں اقبال نے، جو کچھ ،وطن ،مذہب ،اور فرد کے باہمی ربط و تعلق کے بارے میں کہا ہے ، وہ درحقیقت ان کی ساری شاعری کا، اُن کے جملہ افکار و خیالات کا عطر اور لب لباب ہے ، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں ، یہ بات اس طرح کہی جا سکتی ہے . کہ اقبال کے یہ خیالات ، اسلام کی صحیح ترجمانی ہیں ۔

(۷)

فرقہ وارانہ مصالحت

دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) میں مندوبین کی اور حکومت برطانیہ کی کوشش یہ تھی کہ ، اقلیتوں کا مسئلہ خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو جائے ، کہ بغیر اس کے ، نہ آزادی کا مسئلہ طے ہو سکتا تھا ، نہ اس کی تفصیلات کا ، اقبال خود ایک مندوب تھے . وہ بتاتے ہیں کہ مساعی مصالحت کس طرح ناکام ہوئیں ؟

گول میز کانفرنس کی مقرر کردہ :۔

اقلیت کمیٹی کی دو نشستیں ۲۸ ستمبر اور یکم اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ہوئیں ، دونوں موقعوں پر فرقہ وارانہ مسئلہ کو پرائیویٹ طریق پر سلجھانے کی خاطر مجلس کو ملتوی کرنا پڑا مہاتما گاندھی نے مسلم نمائندوں سے پہلے تو یہ کہا ، کہ جب تک ڈاکٹر انصاری یہاں نہ بلائے جائیں گے ، معاملہ آگے نہیں بڑھ سکتا ، یہاں ناکام ہونے پر انھوں نے مسلم نمائندوں کو یہ سمجھنے کا موقع دیا کہ وہ ذاتی طور پر مسلمانوں کے مطالبات مان لیں گے اور کانگرس ہندوؤں اور سکھوں کو بھی متفق کرنے کی کوشش کریں گے اگر مسلمان

تین شرطیں منظور کرلیں :-

(۱) مخلوط حق رائے دہندگی ،

(۲) اچھوتوں کی نمائندگی علیحدہ نہ ہو ،

(۳) کانگرس کا مکمل آزادی کا مطالبہ ،

مہاتماجی نے کانگرس کے سامنے یہ معاملہ پیش کرنے سے انکار کردیا اور ہندوؤں اور سکھوں کو راضی کرنے میں وہ کامیاب نہ ہوسکے ، ۷ اکتوبر کو دو مشہور ہندو راہنماؤں نے یہ تجویز پیش کی کہ سارا معاملہ سات ثالثوں کے بورڈ کے سپرد کردیا جائے ، لیکن ہندو اور سکھ راہنماؤں نے اسے بھی قبول نہ کیا ، ۸ تاریخ کو اقلیت کمیٹی تیسری بار پھر ملی ، اس مجلس میں مہاتما گاندھی نے فرقہ وارانہ مصالحت کی ناکامی کا ذمہ دار برٹش گورنمنٹ کو قرار دیا ، کیونکہ ان کے نزدیک گورنمنٹ نے ، برٹش انڈین ڈیلیگیشن کے لئے اُن لوگوں کو منتخب کیا تھا ، جو صحیح معنوں میں نمائندگی نہ کرسکتے تھے ، مسلم نمائندوں کی طرف سے سر شفیع مرحوم نے مہاتماجی کی اس بلا وجہ تنقید پر اعتراض کیا ، اور ان کی تجاویز کی مخالفت کی ، مجلس ختم ہوئی اور برٹش انتخاب عام کی وجہ سے بارہ نومبر تک کوئی نشست نہ ہوسکی ، اس دوران میں پندرہ اکتوبر سے غیر رسمی بات چیت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا اور ان گفتگوؤں کا ایک نمایاں عنصر سر جیوفرے کاربٹ (SIR GEOFFERY CARBUTT.) کی اسکیم متعلقہ پنجاب تھی ، یہ اسکیم بیری آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ کی تجاویز سے کافی مشابہ تھی ، اس کا ما حاصل یہ تھا ، کہ انبالہ کو پنجاب سے علیحدہ کرکے باقی حصہ میں مخلوط انتخابات رائج کئے جائیں ، لیکن ہندو اور سکھ راہنماؤں نے اسے بھی رد کردیا ، جو باوجود مخلوط انتخابات کے پنجاب میں مسلم اکثریت کو برداشت نہ کرسکتے تھے ، ان گفتگوؤں کی ناکامی پر اقلیتوں کے

نمائندوں نے جو قریباً نصف ہند پر حاوی ہیں، آپس میں باہمی معاہدہ کے امکان کے متعلق مشورہ کرنا شروع کیا، ۱۲ نومبر کو سکھوں کے ماسوا تمام اقلیتوں نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے، جو اقلیت کمیٹی کے آخری اجلاس منعقدہ ۱۳ نومبر کے موقعہ پر برطانوی وزیر اعظم کو دے دیا گیا!"

ان تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ تصفیہ کے سلسلہ میں، گاندھی جی نے کیسی عجیب وغریب شرطیں عائد کیں، سکھ قوم کو اس موقعہ پر مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے "عجیب وغریب قوم" کا خطاب اس کی خود پرستی اور ضد سے تنگ آکر دیا تھا، لہٰذہ وہ اگر فرقہ وارانہ مفاہمت کے راستہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہوتی رہی تو مقام تعجب نہیں ہے۔ لیکن ان دل شکن اور مایوس کن حالات کے باوجود "اقبال نے ہمت نہیں ہاری، وہ تصفیہ و مفاہمت کی ہر کوشش میں دل وجان سے حصہ لیتے رہے۔

دشواری رہ وستم ہمرہاں نہ پوچھ۔

وفاقی (فیڈرل) نظام حکومت کا اجرا ہندوؤں کی دیرینہ تمنا تھی کہ اس طرح انھیں وہ سب کچھ مل جاتا تھا جس کے وہ متمنی تھے، انگریز بھی اسے نافذ کرنے پر تلے ہوئے تھے، کہ ان کے استعماری مقاصد صرف اسی طرح پورے ہوسکتے تھے، ہندوستان کی دوسری اقلیتیں بھی برضاء و رغبت یا بہ جبر و اکراہ اسے قبول کرنے پر آمادہ تھیں کہ ان کے خیال میں،

آب چو از سر گزشت چہ یک نیزہ، چہ یک دست

لیکن مسلمان اڑے ہوئے تھے، کہ اس نظام کو رائج نہیں ہونے دیں گے۔ اُس لئے کہ اس کا نفاذ ان کی خودی اور ملی انفرادیت کے خلاف تھا۔ قائداعظم نے

جو اس وقت تک صرف مسٹر جناح تھے، مجلس تشکیل وفاق (FEDRAL STRUCTURE COMMITTE) کے ممبر کی حیثیت سے "وفاق" کے خلاف ایسی زوردار، مدلل اور مبرہن تقریر کی کہ صدر مجلس لارڈ سینکے نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا۔

"مسٹر جناح آپ نے ہمارے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دیا"!

مسلم مندوبین نے پھر یہ طے کیا کہ اس کمیٹی کی کاروائیوں میں حصہ نہ لیں، لیکن بعض ممبروں نے اس طے شدہ پالیسی کے خلاف، بعد کے اجلاسوں میں نہ صرف شرکت کی، بلکہ سرگرم حصہ لیا اور بات یوں بنائی کہ "مفاد ملکی" کا تقاضا یہی تھا۔ اقبال کو یہ بات بہت گراں گزری، اور وہ کسی طرح بھی ملت کے ان باغیوں اور خطا کاروں کو معاف نہ کر سکے، چنانچہ حیرت اور افسوس کے ساتھ کہتے ہیں :۔

"میرے لئے صرف ایک چیز راز رہی، اور شاید اب تک راز ہے، وہ ۲۵ نومبر کو مجلس تشکیل وفاق، میں ہمارے نمائندوں کا اعلان ہے، جب انھوں نے بیک وقت خود اختیاری صوبجاتی حکومت اور مرکزیت کو قبول کیا، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ مصالحت اور ملک کی عام سیاسی آزادی کے لئے مضطرب تھے، ۵ انومبر کو یعنی جس روز میں نے ڈیلی گیشن سے علیحدگی اختیار کی مسلمان نمائندوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فیڈرل تشکیل کمیٹی کے مباحث میں شرکت نہیں کریں گے، میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے فیصلے کے خلاف عمل کیوں لیا؟ البتہ اس قدر ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مسلمان اس اعلان کو نہایت مہلک غلطی سمجھتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ کانفرنس اس اہم معاملہ پر اپنے خیالات کا اظہار پرزور طریقے سے کرے گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے خطبہ میں میں نے آل انڈیا فیڈریشن کے خلاف

آواز بلند کی تھی، بعد کے واقعات سے ظاہر ہو گیا ہے کہ یہ ملک کی سیاسی ترقی کے لئے سنگ راہ ہے۔ اگر مرکزیت کے اجزاء کا انحصار کل ہند وفاق پر ہے، جس کے لئے میری رائے میں کافی عرصہ درکار ہوگا تو حکومت کو برطانوی صوبجات میں ذمہ دارانہ گورنمنٹ کا انتظام کرنا چاہئے، تاکہ بنیادی مرکزیت کے آنے تک تجربہ کے بل پر وفاقی عمارت کا بوجھ برداشت کر سکے۔ جدید فیڈرل اسٹیٹ کے حصول میں ہمیں بہت کچھ ابتدائی کام کرنا ہوگا۔ میرا خیال ہے اور ڈیلی گیشن سے قطع تعلق کرنے سے چند روز قبل مجھے اس کا شبہ بھی گزرا تھا، کہ ہمارے نمائندوں نے بعض انگریز سیاستدانوں کے مشورہ پر صوبجاتی ذمہ دارانہ حکومت کو ٹھکرانے میں غلطی کی ہے، حال ہی میں ایک انگریزی مقالہ نگار نے بھی اس خیال کا اظہار کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ "اعتدال پسند لیڈروں نے چند انگریز مدبروں کا غلط مشورہ قبول کیا ہے، کہ صوبجاتی آزادی کی قسط کو رد کر دیا۔ یہ عجیب امر ہے کہ مہاتما جی بھی بظاہر اس خط پر غور کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے یہاں کون اعتدال پسند راہنماؤں کی طرف اشارہ کیا ہے؟ سر تیج بہادر سپرو نے صوبجاتی خود مختاری کے متعلق جو رویہ لندن میں اور اب مجلس شوریٰ (CONSULTATIVE COMMITTE) میں اختیار کیا ہے، اس کے پیش نظر یہ صاف ظاہر ہے کہ صاحب مقالہ کی مراد ہندو لیڈروں سے نہیں ہو سکتی، میرا قیاس ہے کہ اس کی مراد مسلم ماڈریٹ لیڈروں سے تھی جن کا فیڈرل تشکیل کمیٹی میں ۲۶ نومبر کا بیان برطانوی وزیر اعظم کے اعلان کا ذمہ دار ہے۔ جس میں بروقت مرکزی اور صوبجاتی حکومت کے سلسلہ میں بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت کے لئے ہمارے

نئی مطالبات کا اعلان لازم تھا، لیکن موجودہ صورت حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس مقام پر برطانوی وزیراعظم کی خاموشی (جس سے ملّت اسلامیہ میں بہت سے شبہات پھیل گئے ہیں) کی وجہ خود ہمارے رہنماؤں کا طرز عمل ہے۔"

اس صورت حال نے اقبال ہی کو نہیں ساری ملّت اسلامیّہ کو دل گرفتہ کر دیا۔ مسلم سندوبین کے ایک طبقہ کی اس روش سے غیروں نے خوب فائدہ اٹھایا، اور مسلمان خسارے میں رہے، انتہا یہ ہوئی کہ وزیراعظم کی تقریر میں جو ان کی پالیسی کا اعلان تھا، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کے تحفظ کا یقین تک نہیں دلایا گیا۔

(۸)

اہم مطالبات

لیکن برطانوی حکومت کا وزیراعظم ہو، یا کوئی اور بڑے سے بڑا فرد ان میں سے کوئی بھی مسلمانوں کی قسمت نہیں بدل سکتا تھا۔ مسلمانوں کی قسمت خود ان کے ہاتھ میں تھی۔ وہی اپنی قسمت کے معمار تھے، گول میز کانفرنس کے ان حالات سے اقبال متاثر تو ہیں، لیکن مایوس نہیں وہ اپنے مطالبات پھر دہراتے ہیں، اور مسلمانوں کی نئی متوقع پالیسی کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں:۔

"برطانوی وزیراعظم کے اس افسوس ناک اعلان کے بعد دوسرا سوال جو پیدا ہوتا ہے وہ کسی نئی پالیسی کی تشکیل ہے، مسلمان قدرتی طور پر فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے بارے میں حکومت کے رویہ سے بدظن ہو گئے ہیں، انہیں اندیشہ ہے کہ

حکومت کانگریس سے ہر قیمت پر مفاہمت کے لئے تیار ہے، اور مسلمانوں کے مطالبات کی قبولیت کی تاخیر بھی اسی جماعت سے گفت و شنید کی وجہ سے ہے سیاسی امور میں حکومت پر اعتماد کرنے کی پالیسی اب مسلمانوں کے دل سے نکلتی جارہی ہے۔ جہاں تک عارضی سمجھوتے کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ مسلمان کسی ایسے فرقہ وارانہ سمجھوتہ پر خواہ عارضی ہو یا مستقبل، رضامند نہیں ہو سکتے جو انھوں نے ایسے صوبوں میں جہاں وہ فی الواقعہ اکثریت میں ہیں۔ حق اکثریت نہیں دیتا۔ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا قیام اور سرحدی صوبہ کی حیثیت اگرچہ متعین ہو چکی ہے۔ لیکن مکمل صوبائی آزادی، پارلیمان سے ہندوستانی صوبوں کو طاقت کا انتقال، تمام وفاقی حصوں کی مساوات، موضوعات (Subjects) کی وفاقی اور صوبائی طریقہ پر، نہ کہ وفاقی اور مرکزی طریقہ پر تحدید، سندھ کی غیر مشروط علیحدگی، مرکز میں ایک تہائی حصہ کے حقوق بھی ہمارے مطالبات کی نہایت اہم شقیں ہیں، وزیر اعظم کی خاموشی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایک طرف کانگریس سے جنگ ہے اور دوسری طرف باقی ملک سے بھی مصالحت نہیں!"

(۹)

ایک سوال اور اُس کا جواب

ان حالات میں خاص طور پر برطانیہ کے ہندو دوست وزیر اعظم کے دل شکن اعلان کے بعد مسلمانوں کا ایک طبقہ یہ سوچنے لگتا ہے، پھر ہم کانگریس ہی میں کیوں نہ شریک ہو جائیں تاکہ نقصان بلیہ اور شماتت ہمسایہ سے تو بچیں؟ اقبال اس سوال کو اٹھاتے ہیں۔

اور جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:۔

"پھر کیا ہمیں کانگریس کی موجودہ جدوجہد میں شرکت نہیں کرنی چاہیئے؟ میں بغیر کسی تامل کے کہتا ہوں "ہرگز نہیں" اس تحریک کے بنیادی محرکات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ میرے نزدیک اس تحریک کی بنا نفرت اور غصہ پر ہے، کانگریسی لیڈر تمام ہندوستان کے واحد نمائندہ ہونے کے مدعی ہیں، لیکن آخری گول میز کانفرنس نے ثابت کر دیا ہے کہ صورت حال بالکل برعکس ہے۔ قدرتی طور پر یہ احساس ان کے لئے خوش آئند نہیں، وہ جانتے ہیں کہ برطانوی حکومت اب فرقہ وارانہ سمجھوتہ کی اہمیت کو سمجھتی ہے وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اقلیتوں کے مابین معاہدہ ہو چکا ہے اور برطانوی حکومت اپنا ہنگامی فیصلہ نافذ کرنے پر تیار ہے۔ اگر ہندوستان کی مختلف جماعتیں کسی فیصلہ پر یک جا نہ ہو سکیں۔ کانگریسی لیڈروں کو ڈر ہے کہ برطانوی حکومت اپنا فیصلہ کرتے وقت کہیں اقلیتوں کے مطالبات نہ مان لے اور اسی لئے انھوں نے موجودہ تحریک کو جاری کر دیا ہے۔ تاکہ ایک بے بنیاد مطالبہ کو قوت دیں، اور اس طرح اس معاہدہ کو ناکام کر دیں جو شاید آئندہ دستور میں جگہ پائے اور حکومت کو مجبور کر سکیں، کہ وہ اقلیتوں کا معاملہ کانگریس کے ساتھ طے کرے، کانگریس نے جس قرارداد کی بنا پر موجودہ جدوجہد شروع کی ہے، اس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ چونکہ حکومت نے مہاتما گاندھی کو ملک کا واحد نمائندہ تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے کانگریس نے جدوجہد جاری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، پھر کوئی اقلیت ایسی تحریک میں کیسے شامل ہو سکتی ہے جو جس قدر حکومت کے خلاف ہے اتنی اس کے خلاف بھی ہے۔"

یہ بالکل وہی دلیل ہے جو آخر میں قائدِ اعظم کی زبان پر تھی، اقبال نے ۱۹۳۲ء میں جو کچھ کہا، قائدِ اعظم نے اس کا اعادہ ۱۹۴۲ء میں کیا!

(۱۰)

حکومتِ برطانیہ کو انتباہ!

آخری گول میز کانفرنس میں یہ طے ہوا کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ باہمی طور پر حل نہ ہوا، تو برطانوی حکومت ثالث کی حیثیت سے ایوارڈ دے دیگی۔ اور وہ لازمی طور پر سب کے لئے قابلِ قبول ہوگا۔

اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے، کہ برطانوی وزیر اعظم کو ثالث بنانے کی تحریک سربرآوردہ ہندو لیڈروں ــــ مالوی جی وغیرہ ــــ کی طرف سے پیش ہوئی، گاندھی جی اور سرتیج بہادر سپرو (؟) نے اپنی خاموشی سے اس کی تائید کی، مسلمان برابر اس پر اڑے رہے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ قبول نہیں کریں گے جو ان کے واضح مطالبات کو پورا نہ کرتا ہو۔ مثلاً جداگانہ انتخاب، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت۔ اقبال اس موقع پر حکومت برطانیہ کو متنبہ کرتے ہیں:ــ

"میں معاملہ کو پوری وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ برطانیہ نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا عارضی فیصلہ کرنے کا بیڑا اٹھایا، اس شرط پر کہ گول میز کانفرنس کے نمائندوں کی واپسی کے بعد ہندوستان کی جماعتیں آپس میں کسی سمجھوتہ پر پہنچ نہ سکیں، یہ اعلان برطانیہ کے دعویٰ اور پالیسی کے عین مطابق تھا کہ اس کی حیثیت بے لاگ پارٹی کی ہے، جو ہندوستان کی باہم مخالف جماعتوں

کے درمیان توازن قائم رکھتی ہے، لیکن برطانوی حکومت کے موجودہ رویہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا مقصد توازن قائم کرنا نہیں، بلکہ وہ بالواسطہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتوں یعنی ہندو اور مسلمان کو خانہ جنگی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ہم نے اکثریت والی جماعت کو آزمایا لیکن اس نے ان تحفظات کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، جن کے بغیر کوئی قوم آزادی سے زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ دوسرا چارہ کار یہ تھا کہ برطانیہ سے انصاف کی توقع کی جاتی خصوصاً اس لئے بھی کہ مسلمانوں سے ملک چھین کر انگریز نے ہمیشہ دعویٰ کیا۔ کہ وہ ہندوستان میں غیر جانبداری سے توازن قائم رکھتا ہے۔ لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز کا وہ پہلا حوصلہ اور ٹھراہن جاتا رہا۔ اور اس کی جگہ ہر دم بدلنے والی پالیسی نے لے لی ہے۔"

(۱۱)

اپنے وجود کو مٹا دو

سیاست کی دنیا میں اقبال کو صحیح ماحول میسر نہ آیا، سچے پیرو نہ ملے، مخلص ساتھی اور رفیق آمادۂ تعاون نہ رہے، ورنہ یقیناً وہ ایک انقلابی زعیم ثابت ہوتے،

انگریزوں کی چالبازی اور ہندوؤں کی چیرہ دستی سے اقبال اب عاجز آچکے تھے وہ مسلمانوں کو کھلے الفاظ میں بغیر کسی ذہنی تحفظ (MENTAL RESERVATION) کے دعوت دیتے ہیں، میدان عمل میں اترو، اپنے قومی مقاصد کے حصول میں جان کی بازی لگا دو، یا زندہ رہو یا مٹ جاؤ، خود دار اور باعزت قوموں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔

"اگر آپ کا فیصلہ موجودہ حکمت عملی کو خیرباد کہنے کا ہو، تو آپ کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ پوری جماعت کو ایثار کے لئے تیار کریں، جس کے بغیر کوئی غیرت مند قوم باعزت زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے نازک وقت آن پہنچا ہے۔ اپنا فرض بجا لایئے یا اپنے وجود کو مٹا دیجئے۔"[1]

(۱۲)

اکثریت اور اقلیت کی جنگ

اقبال عملی طور پر بہت بڑے سیاستدان تھے، انھوں نے، اپنے زمانہ کی سیاسی جدوجہد کا جائزہ لیتے ہوئے اور صورتِ احوال کا صحیح تجزیہ کرتے ہوئے بڑے پتہ کی، اور بڑی دور کی بات کہی ہے، وہ ہندوستان کی تحریک آزادی پر بحث و گفتگو کرنے کے بعد، ارشاد فرماتے ہیں:—

"ہندوستان کی موجودہ تحریک کو مغرب کے خلاف بغاوت کے نام سے پکارا جاتا ہے، لیکن میرا خیال ہے، کہ یہ مغرب کے خلاف بغاوت نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستانی مغربی اداروں کا ہی اپنے ملک کے لئے مطالبہ کرتے ہیں، یہ ایک الگ سوال ہے، کہ کاشتکاروں کے ملک میں جو موجودہ جمہوریتوں کی اقتصادیات سے محض نابلد ہو، انتخابات، پارٹی لیڈر اور پارلیمان کی خیالی شان و شوکت راس آئیں گے یا نہیں؟ تعلیم یافتہ شہری حصہ جمہوریت کا طلبگار ہے۔ اقلیتیں جو اپنے تمدنی وجود کا احساس رکھتی ہیں۔ اور جن کی

بقا خطرہ میں ہے، تحفظات چاہتی ہیں، جسے اکثریت تسلیم نہیں کرتی۔ اکثریت قومیت میں یقین رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے، جسے اگر مغربی حالات سے دیکھا جائے تو نظری طور پر صحیح ہے، لیکن اگر ہندوستان کے حالات سے دیکھا جائے تو عملی طور پر غلط ہے، پس موجودہ جدّوجہد انگلستان اور ہندوستان کے مابین نہیں ہے۔ بلکہ اکثریت اور اقلیتوں کے درمیان ہے۔۔ اقلیتیں مغربی جمہوریت کو قبول نہیں کر سکتیں، جب تک کہ اس میں ہندوستان کے حالات کے مطابق ترمیم نہ کی جائے۔"

(۱۳)

سخت بنو اور سختی جھیلو

اقبال نے بار بار مسلمانوں کو جھنجھوڑا، اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش اور اس موقع پر "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق، وہ برطانوی حکومت سے بھی ٹکر لینے کو تیار نظر آئے، وہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر یہ فیصلہ کُن دَور یونہی گذر گیا اور مسلمان اپنے مستقبل کی فلاح و اصلاح کے لئے کچھ نہ کر سکے تو پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے ان پر سیاسی موت طاری ہو جائے گی، نہ انگریز انھیں کوئی اہمیت دیں گے، نہ ہندو ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔ دیکھئے کس تیور، اور کس لب و لہجہ میں وہ واشگاف اور برہنہ الفاظ میں کہتے ہیں:۔

"خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنا نصب العین متعین کر کے خود اپنی حالت کو نہیں بدلتی، کامیابی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ

انسان کو خود اپنی قلبی زندگی کی آزادی میں یقین ہو یہی یقین تو ہے جو قوم کی نظر اپنے مقصد سے ہٹنے نہیں دیتا اور تذبذب سے نجات دلاتا ہے، جو سبق ہمیں پرانے تجربہ سے ملا ہے وہ بھولنا نہیں چاہیئے، کسی طرف سے کسی قسم کی توقع نہ رکھو، خود اپنے اوپر نظر جماؤ۔ اپنی خاک کو انسانیت کی یگانگی بخشو۔ اگر تم اپنے ارادوں میں کامیاب ہونا چاہتے ہو، مسولینی کا قول تھا، "جو قوت رکھتا ہے، دولت رکھتا ہے" میں کہوں گا، جو قوت مجسّم ہے اسے سب کچھ میسّر ہے۔ سخت بنو اور سختی جھیلو، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہی راز ہے۔ ہمارے نصب العین کا تعیّن ہو چکا ہے۔ ہمیں آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایک ایسی جگہ فتح کرنی ہے جو آگے چل کر اس ملک میں، اس کے مقاصد کی تکمیل میں مددگار ثابت ہو۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس مقصد کی روشنی میں جماعت کی ترقی پذیر صلاحیتوں کو بیدار کیا جائے اور اس کی خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑا جائے۔ شعلۂ حیات مستعار نہیں لیا جاتا، اسے تو خود اپنی روح کے مندر میں فروزاں کیا جاتا ہے، اس کے حصول کے لئے پیہم مستعدی کی ضرورت ہے اور ایک مستقل پروگرام کی،!"

(۱۴)

صرف ایک سیاسی جماعت

مسلمانان متحدہ ہندوستان کے لئے صرف ایک سیاسی جماعت کا خواب بھی

پہلے پہل اقبال ہی نے دیکھا تھا، بعد میں اس کی تعبیر قائد اعظم کے ہاتھوں پوری ہوئی۔

مسلم کانفرنس میں، مولانا حسرت موہانی نے ایک "آزاد پارٹی" قائم کی، یہ پارٹی جماعت کے اندر رہ کر اپنے خیالات کی نشر و اشاعت جماعت ہی کے پلیٹ فارم سے کرتی تھی۔ آمرانہ ذہنیت رکھنے والا کوئی صدر ہوتا تو وہ فوراً انضباطی کارروائی کرتا، اور مولانا حسرت وغیرہ کو جماعت سے خارج کر دیتا۔ لیکن اقبال اسلامی جمہوریت کے علمبردار تھے وہ اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والوں کو مستوجب تعزیر و عقوبت نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ خندہ جبینی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے تھے وہ اسے پسند کرتے تھے کہ مختلف الفکر سیاسی راہنما ایک مرکز پر جمع رہیں، بہ نسبت اس کے کہ ہر شخص ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے اور اس طرح مسلمانوں میں افتراق و انتشار کا موجب بنے:

۱۶ جولائی ۱۹۳۲ء کو اقبال نے مولانا حسرت موہانی کی انڈی پنڈنٹ پارٹی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ایک بیان شائع کیا، جس کا ایک اہم اور ضروری حصہ یہ ہے:-

"آل انڈیا مسلم کانفرنس کے بعض چیدہ چیدہ ممبران کے الہ آباد میں ۴ جولائی کو منعقد کردہ جلسے کی کارروائی میری نظر سے گذری، جس کانفرنس میں ایک انڈی پنڈنٹ پارٹی (Independent Party) کی تشکیل کو خوش آمدید کہتا ہوں، مسلم کانفرنس کے لاہور میں منعقدہ اجلاس میں میں نے اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ قوم کی قیادت کے معاملہ میں اچھی طرح سوچ بچار نہیں کیا جاتا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات بہت ہی نازک موقعوں پر ہماری سیاسی جماعتوں میں ناچاقی اور بگاڑ پیدا ہو

جاتا ہے۔ اس طرح یہ ادارے پورے طور پر اپنے اندر وہ ضبط اور تادیب نہیں پیدا کر سکتے، جو سیاسی جماعتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔ میرے نزدیک اس کا واحد علاج یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جماعت صرف ایک ہی ہونی چاہئے اور ملک کے ہر صوبے اور ضلع میں اس کی شاخیں ہوں۔ اس جماعت کا نام کچھ بھی رکھ لیا جائے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ اس کا دستور العمل ایسا ہونا چاہیئے کہ ہر قسم کے سیاسی خیال کے لوگ برسرِ اقتدار آکر اپنے خیالات اور اصولوں کے مطابق قوم کی صحیح قیادت کر سکیں۔!"

"میرے خیال میں یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم آپس کے بگاڑ اور اختلافات کو دور کر کے ضبط و تادیب پیدا کر سکتے ہیں اور اس طرح قوم کے بکھرے ہوئے شیرازہ کو مجتمع کر کے اسلام کی زیادہ سے زیادہ خدمت ممکن ہے۔ اس لئے میں کہہ سکتا ہوں، کہ بلا شک و شبہ مولانا حسرت موہانی اور دوسرے اصحاب نے کانفرنس میں ایک نئی پارٹی کی تشکیل کر کے منزلِ مقصود کی طرف ایک کامیاب قدم اٹھایا ہے۔!"

(۱۵)

ہندوؤں کی بالادستی تسلیم ہے

جائز حد کے اندر، اقبال، اکثریت کی بالادستی قبول کرنے پر تیار تھے، وہ کہتے تھے۔ جس طرح ہندوستان کے بہت سے صوبوں میں، ہندو اکثریت برسرِ عمل آئے گی اور مسلمان اقلیت کی حیثیت سے اسے تسلیم کریں گے، اسی طرح چند صوبوں میں

جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں، مسلم اکثریت برسرِ عمل آنی چاہیئے اور ہندو اقلیت کو یہ اکثریت بغیر کسی تامل کے تسلیم کر لینی چاہیئے، تو ان طاقت اسی طرح قائم رہ سکتا ہے، اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے۔ ۲۵ جولائی ۱۹۳۲ء کو انھوں نے ایک طویل بیان اس سلسلہ میں شائع کیا، جس کا یہ ٹکڑا خاص طور پر توجہ طلب ہے:-

"ہماری اپنی پوزیشن بالکل واضح ہے، مسلمانانِ ہند جہاں اپنے قومی تحفظ کے لئے کوشاں ہیں، وہاں وہ ملک کی آئینی ترقی کے بھی دل سے خواہش مند ہیں، ہندوستان میں ایک بڑی اقلیت کی حیثیت سے وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہتے ہیں، جو بے حد ضروری ہے، وہ مرکز کے علاوہ ان صوبوں میں جہاں وہ بہت قلیل تعداد میں ہیں، اکثریت والی قوم کے غلبہ کے اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، بشرطیکہ انھیں بھی، بعض دوسرے صوبوں میں اپنی اکثریت سے اس قسم کا فائدہ اٹھانے دیا جائے، مسلمان اپنی ہمسایہ قوموں اور حکومت برطانیہ کے سامنے اپنا یہ نظریہ متعدد بار پیش کر چکے ہیں اور سکھوں کے سوا باقی تمام اقلیتوں نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم بھی کر لیا ہے۔"

(۱۶)

سر جوگندر سنگھ

فرقہ وارانہ تصفیہ کی ساری کوششیں، سکھوں کی ہٹ اور ضد کے باعث ناکام ہوئیں، پنجاب میں وہ ایک معمولی اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے، کسی ضلع میں

حتیٰ کہ امرتسر تک میں اُنھیں اکثریت حاصل نہیں تھی، لیکن ایک طرف تو وہ پنجاب میں مسلم اکثریت کو غیر موثر بنا دینا چاہتے تھے۔ دوسری طرف اپنے لئے حق اور انصاف کے حدود سے گزر کر کہیں زیادہ مراعات اور تحفظات کے طالب تھے، مسلمان انھیں ان کے حق سے زیادہ دینے پر تیار تھے، لیکن نہ اتنا کہ خود کہیں کے نہ رہیں، لندن میں گول میز کانفرنس کی اقلیت کمیٹی ضرور کامیاب ہو جاتی، اگر سکھ ضد نہ کرتے، کیونکہ دوسری تمام اقلیتیں متحد ہو چکی تھیں۔

جب برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے ثالثی فیصلے کے اعلان کا وقت آیا تو سکھوں نے اندازہ لگایا، اگر وہ مصالحت کر لیں تو زیادہ فائدہ میں رہیں گے۔ چنانچہ سر جوگندر سنگھ نے اقبال کو، جو مسلم کانفرنس کے صدر تھے، اس سلسلہ میں ایک خط لکھا یہ خط بڑی چالاکی کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ اس میں مسلمانوں کی ۵۱ فیصد نشستیں صوبائی اسمبلی میں، مختلف مخلوط اور جداگانہ حلقوں سے تسلیم کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا تھا اور اقلیتوں کے مجوزہ معاہدہ پر بھی سکھ رضامند تھے، بشرطیکہ :۔

(۱) مرکزی مجلس آئین ساز میں، مسلمان سکھوں کو ۵ فیصد نشستیں دلانے کی جدوجہد کریں۔

(۲) صوبہ سرحد میں ۷ فیصد نشستیں، مسلمان سکھوں کو دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

(۳) مرکزی کابینہ میں ایک نشست، لازمی طور پر سکھوں کے لئے مخصوص کرانے میں مسلمان مدد دیں۔

سر جوگندر سنگھ سے اقبال کے بڑے بے تکلفانہ، دوستانہ تعلقات تھے، لیکن اس موقع پر اقبال نے ذاتی دوستی پر قوم کی دوستی کو ترجیح دی۔ ۱۵ اگست ۱۹۳۲ء کو

ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا:۔

"سر جوگندر سنگھ نے جو خط مجھے بھیجا تھا، اس میں انھوں نے صاف الفاظ میں مسلم نشستوں کی تعداد ۸۵ اور غیر مسلموں کی تعداد ۸۷ لکھی تھی، اس میں شک نہیں کہ یہ تعداد مخصوص حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ان کے اپنے اندازے پر مبنی تھی لیکن وہ مجھے معاف کریں، اگر میں صاف بیانی سے کام لوں، ان مخصوص حلقوں سے مدعا مجھے اس دھوکے میں ڈالنا تھا، کہ سردار صاحب اسمبلی میں مسلمانوں کی اس اکثریت پر ایک کی کثرت پر رضامند ہیں۔ دوسری طرف اُن کی دی ہوئی تعداد کے باوجود میں ان کی اس بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا، جو انھوں نے بغیر تعداد مقرر کیے ہوئے صاف طور پر ظاہر کر دی ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کو مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کی نشستوں میں کچھ نشستیں ملنے کا امکان ہو سکتا ہے۔

مجھے اس امر سے اتفاق ہے، کہ انھوں نے صرف ایک امکانی صورت پیش کی تھی، لیکن اگر ہمارے سکھ بھائیوں نے حالت کو اسی طرح سمجھا ہے، تو مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا یہ خیال بالکل صحیح تھا کہ اس گفت و شنید سے کسی مفید مطلب سمجھوتے کی امید رکھنی عبث ہے۔!"

(۱۶)

فرقہ دارانہ فیصلہ

بالآخر ایک عرصہ کی تعویق و التوا اور انتظار و اشتیاق کے بعد وزیراعظم کی قیام گاہ

۱۰۔ڈاؤننگ سٹریٹ لندن سے "کمیونل ایوارڈ" شائع ہو گیا۔

اس ایوارڈ میں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کی گئی تھی، لہٰذا کوئی بھی خوش نہیں ہوا۔ لیکن اسے تسلیم کرنے پر سب یوں مجبور ہو گئے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ اس ایوارڈ نے بلاشبہ اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کی تھی، لیکن کانگرس سے کم۔ ایسی صورت میں اقلیتیں مجبور تھیں کہ احتجاج و شکایات کے باوجود اسے قبول کر لیں۔ اس ایوارڈ کا ایک روشن پہلو یہ تھا کہ اگر اقلیتیں باہمی طور پر کوئی سمجھوتہ کر لیں تو اسے حکومت بھی تسلیم کر لے گی۔ اس ایوارڈ میں اچھوتوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا تھا، لیکن گاندھی جی اسے گوارا نہ کر سکے کہ ہندو قوم میں افتراق ہو۔ وہ جیل میں تھے، لیکن مرن برت کا اعلان کر کے دہلی سے لندن تک انھوں نے ہلچل مچا دی۔ آخر سر سپرو نے ڈاکٹر امبیدکر کو راضی کیا۔ کچھ زیادہ نشستیں دیں اور جداگانہ حق نیابت سے انھیں دستبردار کرا لیا۔ اس طرح اگر سکھ، مسلمان، پارسی وغیرہ بھی باہمی طور پر کسی فارمولے پر متحد ہو جاتے تو وہ حکومت کے لئے قابل قبول تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پُر لطف بات یہ ہے کہ اس کی سب سے زیادہ مخالفت ہندوؤں کی طرف سے ہو رہی تھی۔ جنھوں نے خود وزیر اعظم کو ثالث بنایا تھا۔

ایوارڈ کے شائع ہوتے ہی سارے ہندوستان میں تہلکہ مچ گیا اور مخالف و موافق بیان بازی کا غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس موقع پر مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اقبال کے لئے خاموش رہنا کسی طرح بھی ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے مسئلہ کے متعدد پہلوؤں پر ۲۲ اگست ۱۹۳۲ء کو ایک بیان میں سیر حاصل تبصرہ کیا۔ اس کے چند خاص حصص پر ہم ذیل میں گفتگو کرنے کی کوشش کریں گے۔

(۱۷)

سمجھوتہ کا دروازہ کھلا ہے

ایوارڈ کے نکتہ چینوں اور نقادوں کی جلد بازی پر انہیں ٹوکتے ہوئے اور اس سلسلہ میں ٹھوس تجاویز پیش کرنے کی دعوت دیتے ہوئے اقبال نے برادرانِ وطن کو سب سے پہلے یہ یقین دلایا کہ مفاہمت باہمی کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"یہ تنقید ان حقیقتوں کو نظر انداز کرنے والے سیاست دانوں کے لئے اپنی جگہ ایک سبق ہے، جو ہندوستان کے پیچیدہ مسئلہ کو ایک معمولی سی بات سمجھتے ہیں، اور یہ خیال کرتے ہیں کہ سارا ہندوستان ایک قومی نظریہ کا پابند ہے یا ہو سکتا ہے۔ ورنہ تمام آتش بازی کی طرح ایک لمحہ بہار دکھا کر ختم ہونے والے جملے ان لوگوں کی زبان سے نہ نکلتے، جو ایک تیسرے فریق کو اپنے مسائل کا فیصلہ کرنے کے لئے دعوت دے کر اپنی اہلیت کا ثبوت کھو چکے ہیں اور خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس فیصلہ کے باوجود ہمارے درمیان سمجھوتہ کا دروازہ اب بھی کھلا ہے"!

(۱۸)

سر سپرو کا ذکر

پھر سر سپرو کی معاملہ فہمی کی داد دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس بے اصولی تنقید کے سیلاب میں ہندوستانی سیاست سے بے لاگ دلچسپی رکھنے والے کے لئے سر تیج بہادر سپرو کے خیالات کا مطالعہ قابل

اطمینان ہے۔ کیونکہ صاحب موصوف فہیم مدبر ہیں۔ جو موجودہ حالات پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پیچیدہ صورتِ حال کا بانتفصیل حل سوچنے میں بڑے صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں،"!

(۱۹)

اقبال پہ اعتراض اور اُس کا جواب

پھر اپنے ایک نکتہ چین کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اس سلسلہ میں بمبئی کے ایک صاحب کی عجیب و غریب رائے کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ اگر حکومت برطانیہ کی جگہ یہ کام ڈاکٹر اقبال کے سپرد ہوتا، تو بھی یہی فیصلہ ہوتا۔ میں ان صاحب کو یقین دلانا چاہتا ہوں، کہ اگر ہندوستان کے فرقہ وارانہ مسئلہ کا فیصلہ کرنا میرے ذمہ ہوتا تو میں مسلمانانِ ہند سے ہرگز اتنی ناانصافی نہ کرتا، جتنی کہ موجودہ فیصلہ میں کی گئی ہے۔ میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس فیصلہ کے خلاف جتنی جائز شکایات مسلمانانِ ہند کو ہو سکتی ہیں اور کسی فرقہ کو نہیں۔ میں تو حیران ہوں کہ برطانوی ضمیر نے کسی جماعت کے ساتھ اتنی صریح ناانصافی کرنا کیسے گوارا کیا۔؟"

(۲۰)

شکوۂ بے جا

پھر اقبال نے کہا:۔

"غیر مسلموں کی یہ چیخ پکار کہ پنجاب کے مسلمانوں کو اس فیصلہ کی رو سے نمائندگی میں اکثریت حاصل ہو گئی ہے، قطعی بے بنیاد ہے۔ اس صوبہ میں مسلم اکثریت خواہ وہ کسی نوعیت کی ہو، کسی دوسرے فرقہ کے شکایت کا باعث نہ ہونی چاہیئے، خصوصاً جب کہ مسلمانوں کو یہ اکثریت مخلوط انتخاب جیت کر حاصل کرنی پڑتی ہو۔"

(۲۱)

ایوارڈ کی بنیاد

آگے چل کر اقبال بتاتے ہیں:۔

"فیصلہ پر نظر غائر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دو سیاسی اصولوں کو کامیاب بنانے کی کوشش کی گئی ہے، ایک یہ کہ کسی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہ کیا جائے، اور دوسرے یہ کہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ان کو ان کی آبادی کے مقابلہ میں زیادہ نمائندگی دی جائے۔ ان دونوں اصولوں کے نفاذ میں مسلمان ہی خسارے میں رہے۔

بنگال میں مسلمانوں کی پوزیشن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ پہلے اصول کو توڑنے سے مسلمانوں کو نقصان پہنچا ہے۔ اسی طرح دوسرے صوبوں میں اقلیتوں کو ان کی تعداد سے زیادہ جو نمائندگی کے حقوق دیئے گئے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے اصول کو صوبہ سرحد میں ہندوؤں کے لئے زیادہ مفید مطلب بنایا گیا ہے اور مسلمانوں کو

دوسرے صوبوں میں اس قسم کی مراعات نہیں ملیں، پنجاب میں سکھ اقلیت کو اتنی مراعات دی گئی ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت صرف برائے نام ہی رہ جاتی ہے،

بنگال میں مسلمانوں کی آبادی ۵۱ فیصدی ہے، اس کے مقابلہ میں نمائندگی میں وہ صرف ۴۶۸۴ فی صدی رہ گئے ہیں۔ اگر مسلمانانِ بنگال کو ۲ فی صدی اور نمائندگی مل جاتی تو وہاں ان کی اکثریت ہو جاتی، سرکار برطانیہ نے جہاں تک یورپین لوگوں کا تعلق ہے، اقلیتوں کے معاہدہ کی شرائط پر عمل کیا اور جہاں بنگال کے مسلمانوں کا سوال آیا، یہ معاہدہ نظرانداز کر دیا گیا، کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ یورپین لوگوں کا خون، خون ہے اور مسلمانوں کا خون پانی، یا یہ کہ اس غیر منصفانہ فیصلہ سے انگریز کے بہ یک وقت دو مطلب پورے ہو جاتے ہیں۔ ایک یورپین لوگوں کی امداد اور دوسرے ہندوؤں کی خوشنودی۔!"

(۲۲)

اب کیا کیا جائے؟

بنگال کا معاملہ پنجاب سے زیادہ پیچیدہ تھا، مسلمانوں کی وہاں واضح اکثریت تھی۔ لیکن اسے اقلیت بنا دیا گیا تھا۔ اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں :۔

"مسلمانوں کے سامنے اب سوال یہ ہے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے؟

اس سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ اب بھی مسلمانوں کے لئے ایک آئینی قدم اٹھانے کی گنجائش ہے۔ بنگال ان صوبوں میں سے ایک ہے، جہاں دو ایوان ہوں گے، اس کے لئے ایوان اعلیٰ کا دستور ابھی مرتب ہونا ہے۔ ان ایوانوں کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ اور کیا حکومت صرف ایوان ادنیٰ کو جواب دہ ہوگی؟ یا دونوں ایوانوں کو ملا کر یہ امور بھی طے ہونے ہیں، اگر ایوان اعلیٰ میں مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے نمائندگی مل جائے اور حکومت دونوں ایوانوں کے سامنے جواب دہ ہو، تو پھر مسلمانوں کو اس صوبے میں اکثریت کی نمائندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا طریقہ سے بنگالی مسلمانوں کے ساتھ محض انصاف ہی ہوگا۔ کسی قسم کی رعایت نہ ہوگی۔!"

(۲۳)

سیاست کا نیا دور

گول میز کانفرنس کے اختتام کے بعد پہلے کمیونل ایوارڈ (فرقہ دارانہ فیصلہ) پھر قرطاس ابیض (WHITE Paper.) میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں آئندہ نظام حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا تھا، اور یہ بات طے کر دی تھی کہ ہندوستان میں وفاقی نظام حکومت رائج ہوگا۔

اپنے مندرجات کے اعتبار سے قرطاس ابیض مسلمانوں کے لئے ایک مایوس کن دستاویز تھی، مسلمانوں کے بہت سے مطالبات نظر انداز کر دیئے گئے تھے، اور

انھیں ایک ایسی جمہوریت کے حوالہ کیا جا رہا تھا، جو گو مغرب کے لئے مناسب تھی، لیکن ہندوستان کے حالات دیکھتے ہوئے یہاں کی اقلیتوں کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتی تھی۔

(۲۴)

انتخابات کی تیاری

اس موقع پر ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے قرطاس ابیض کے نقائص کا اعتراف کرنے کے باوجود مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ نئے انتخابات کے لئے ابھی سے تیاریاں، شروع کر دیں، کیونکہ انتخابات ہی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی اپنے نتائج کے اعتبار سے کر سکیں گے، انھوں نے فرمایا:-

"جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے، انھیں لازم ہے کہ آنے والے انتخابات کے لئے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسی باتوں سے احتراز کریں جو آپس میں جماعتی اختلافات کا باعث بن سکتی ہیں، مجوزہ نظام میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے اصول کو واضح طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے، اقلیتوں میں قومی نظریہ پیدا کرنے کی یہی صورت ہو سکتی ہے، کہ وہ ان مراعات سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، جو انھیں دی گئی ہیں۔"!

(۲۵)

تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ

اس موقع پر اقبال نے جہاں یہ بتایا کہ حکومت برطانیہ کی منعقد کردہ گول میز کانفرنس

متعدد اعتبار سے مایوس کن ہے، وہاں اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کیا کہ اس نازک اور تاریخی موقع پر اقدام وعمل کے سلسلہ میں کوئی لغزش نہ ہونی چاہیئے :-

"گول میز کانفرنس کے دوسرے نتائج سے قطع نظر اس امر سے بھی کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس ملک میں ایک ایسی قوم کی تخلیق جو بیک وقت جدید اور قدیم ہے، میرا خیال ہے کہ موجودہ تاریخ کا سب سے بڑا اہم واقعہ ہے، ایک دور بین مؤرخ بھی اس نئی، پرانی قوم کی تخلیق کے نتائج کا پورا اندازہ نہیں لگا سکتا، مجھے امید ہے کہ اس قوم کے لیڈر بہت ہوشیاری سے کام لیں گے۔ اور لوگوں میں خود آگہی کے جذبہ کی تربیت کو بیرونی، سیاسی اور معاشرتی اثرات سے بچائے رکھیں گے"

(۲۶)

مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی

پھر ۲۰ مارچ ۱۹۳۳ء کو اقبال نے قرطاس ابیض کی ناانصافیوں سے متعلق ایک طویل بیان شائع کیا اور بتایا کہ مجوزہ آئین میں مسلمانوں کے حقوق کس بے دردی سے پامال کئے گئے۔ اور ان سے کس ڈھٹائی کے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ کیا گیا اور مسلمانوں کے جائز اور مبنی بر انصاف مطالبات بھی کس طرح نظر انداز کر دیئے گئے ہیں، انھوں نے فرمایا۔

"اس قسم کے آئین کے لئے ہندوستان ایسے ملک میں آبادی کے ہر حصہ کو مطمئن کرنا ناممکن ہے۔ اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کوئی جماعت مجوزہ آئین کو اس کے تمام نقائص کے باوجود آزمائشی طور پر اختیار کرنے کے لئے

تیار ہو گی یا نہیں؟ یہ بہت سے واقعات کی نوعیت پر منحصر ہے۔ جن کے گہرے مطالعے کی سخت ضرورت ہے۔

مسلمانوں کے لئے فیڈرل اسمبلی میں ان کی ناکافی نمائندگی بے حد مایوس کن ہے۔ ایوان ادنیٰ میں ۲۷۵ نشستوں میں سے ان کے لئے صرف ۸۲ نشستیں گارنٹڈ کی گئی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ کل ایوان میں مسلمانوں کی نمائندگی صرف ۸ء۲۹ فی صدی ہوگی اور ہندوستانی ریاستوں کو جن کو آبادی کے لحاظ سے فیڈرل اسمبلی میں ۲۵ فی صدی نشستوں کا حق پہنچتا ہے، ۳۳ فی صدی نشستیں دے دی گئی ہیں، یعنی ۸ فی صدی زیادہ، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو سب سے زیادہ اقلیت والی قوم ہونے کی حیثیت سے یہ رعائت مسلمانوں کو ملنی چاہیئے تھی، نہ کہ ریاستوں کو جنھیں کسی صورت میں اقلیت نہیں کہا جا سکتا اور نہ ہی ان کے حقوق کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ موجودہ آئین میں مسلمانوں کے حقوق پامال کر کے مرکزی اسمبلی کو غیر مسلم ممبران سے بھر دیا گیا ہے۔

فیڈرل اسمبلی کا ایک اور قابل اعتراض پہلو یہ ہے کہ اس میں ۹۰ نشستوں میں رائے دہندگان کی اکثریت غیر مسلموں کی ہوگی۔ اس لئے مسلم خواتین کا اسمبلی تک پہنچنا مشکل ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہوگا۔ مسلم عورتوں کو تو مسلم ملت کا ایک جزو سمجھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں سر محمد یعقوب نے فرنچائز کمیٹی کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نوٹ لکھا تھا جس پر بالکل غور نہیں کیا گیا ایوان بالا میں قابل تبدیل ووٹ سسٹم جسے صوبائی اسمبلیوں کے ممبر استعمال

کر سکیں گے، مشترکہ انتخاب کی ترویج کرتا ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس طرح مسلمان نشستوں میں اپنا پورا حصہ حاصل نہ کر سکیں گے،

نئے آئین کے ماتحت صوبوں میں وزراء یجسلیچر کے سامنے اس قدر کم اور گورنروں کے سامنے اس قدر زیادہ جواب دہ ہوں گے، جس قدر اب ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گورنروں کے خاص اختیارات کا دائرہ ضرورت سے زیادہ وسیع ہے۔

بلوچستان کے لئے مجوزہ اسکیم سے نہ تو بلوچی مسلمان مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانانِ ہند۔ اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس آئین میں مسلمانوں کے شرعی قانون کے مناسب تحفظ کا یقین بھی نہیں دلایا گیا۔"

(۲۷)

جواہر لال نہرو سے ٹکر

جواہر لال نہرو اور اقبال دونوں کشمیری تھے، دونوں کو اپنے کشمیری ہونے پر ناز تھا، دونوں میں ذہانت اور بصیرت کی وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں موجود تھیں جن پر بجا طور سے اہل کشمیر فخر کر سکتے ہیں۔ جواہر لال اور اقبال کشمیری ہونے کے باوجود فکر و عقیدہ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ضد تھے۔ جواہر لال سوشلزم کے علمبردار تھے، مذہب کے مخالف تھے، فرقہ پرستی سے انھیں نفرت تھی، اقبال اسلامی اشتراکیت کے مبلغ تھے، مذہب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، مرد مسلمان کو وہ مافوق الانسان (SUPER-MAN.) سمجھتے تھے، سیاسیات وطنی میں بھی دونوں کی منزل الگ تھی

جواہر لال یک قومی نظریہ کے حامی تھے اور متحدہ ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے، اقبال دو قومی نظریہ کے داعی تھے اور تقسیم ہند کا سنسنی خیز مطالبہ کر چکے تھے، جواہر لال مسلمانوں کی انفرادیت نہ قائل تھے نہ اسے کوئی اہمیت دیتے تھے۔ اقبال ان دونوں چیزوں پر بضد تھے لیکن اس اختلاف فکر و نظر کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے مداح اور معترف بھی تھے۔

(۲۸)

اقبال جواہر لال کی نظر میں

قبل اس کے کہ ہم اقبال اور جواہر لال کی سیاسی ٹکر کی داستان بیان کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ دیکھیں، جواہر لال کی نظر میں اقبال کی کیا حیثیت تھی؟ اور اقبال جواہر لال کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟ پہلے جواہر لال کو لیجئے وہ اپنی کتاب تلاش ہند (DISCOVERY OF INDIA.) میں لکھتے ہیں:-

"آخر عمر میں اقبال کا رجحان اشتراکیت کی طرف بڑھتا گیا، سویٹ روس کی زبردست کامیابی نے ان کو بہت متاثر کیا اور اُن کی شاعری کا رخ بدل گیا اپنی وفات سے چند ہفتے پہلے جب وہ بستر علالت پر تھے، انھوں نے مجھے بلا بھیجا اور میں نے بڑی خوشی سے ان کے حکم کی تعمیل کی، جب میں مختلف مسائل پر اُن سے گفتگو کر رہا تھا، تو میں نے یہ محسوس کیا کہ باوجود اختلاف کے ہم دونوں میں کس قدر اشتراک خیال ہے، اور کتنی آسانی سے ان کے ساتھ نباہ ہو سکتا ہے۔ ان کو پرانی باتیں یاد آ رہی تھیں اور وہ ایک موضوع

سے دوسرے موضوع پر پہنچ جاتے تھے۔ میں خود بہت کم بول رہا تھا اور بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

میں ان کا اور ان کی شاعری کا مداح تھا، اور مجھے بڑی خوشی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتے ہیں، اور میرے متعلق اچھی رائے رکھتے ہیں۔ میرے رخصت ہونے سے ذرا پہلے انھوں نے مجھ سے فرمایا،

تم میں اور جناح میں کیا چیز مشترک ہے؟

"وہ ایک سیاستدان ہے اور تم ایک محبِ وطن ہو"

مجھے امید ہے کہ مجھ میں اور مسٹر جناح میں اب بھی بہت کچھ مشترک ہوگا۔ اب رہا میرا محبِ وطن ہونا تو یہ آجکل کوئی قابلِ تعریف چیز نہیں سمجھی جاتی۔ خصوصاً اس محدود معنی میں جس میں یہ لفظ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے ہندوستان سے بڑی محبت ہے، لیکن میں یہ ایک عرصہ سے محسوس کر رہا ہوں کہ ساری دنیا کے مسائل تو درکنار خود اپنے ملک کے مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے کے لئے ہمیں قومی ہمدردی سے زیادہ وسیع جذبے کی ضرورت ہے۔ لیکن اقبال کا یہ خیال یقیناً صحیح تھا، کہ میں کچھ زیادہ سیاست دان نہیں ہوں، اگرچہ سیاست نے مجھے اپنے چنگل میں دبا رکھا ہے!

(۲۹)

جواہر لال اقبال کی نظر میں

۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو جواہر لال نے ایک بے دردانہ بیان کانگریس کی حمایت اور

مسلمانوں کی سیاسی روش کے خلاف شائع کیا، یہ چیز اقبال کے لئے ناقابل برداشت تھی وہ خاموش نہ رہ سکے، انھوں نے ۶ نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک بیان میں جواہر لال کو للکارا۔ لیکن اپنے دل میں جواہر لال کی جو قدر رکھتے تھے، اُسے چھپا نہ سکے، فرماتے ہیں:-

"میں پنڈت جواہر لال نہرو کے خلوص اور صاف گوئی کی ہمیشہ سے قدر کرتا رہا ہوں۔ لیکن ان سے مجھے کبھی ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ مہاسبھائی معترضین کے جواب میں جو تازہ ترین بیان انھوں نے دیا ہے اس سے خلوص ٹپکتا ہے اور یہ چیز آج کل کے ہندوستانی سیاستدانوں میں بہت کم یاب ہے۔ بہر حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے تین سالوں میں جو گول میز کانفرنسیں جو لندن میں منعقد ہوئی ہیں ان میں شریک ہونے والے مندوبین کے رویہ کے متعلق انھیں پورے حالات معلوم نہیں ہیں۔!"

(۳۰)

گاندھی جی کا ذکرِ خیر

جواہر لال نے اپنے بیان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کو سب کچھ دے دیا تھا، مگر مسلمان پھر بھی راضی نہ ہوئے۔ جواہر لال گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے تھے، اقبال گاندھی جی کے پہلو بہ پہلو وہاں موجود تھے، لہٰذا انھوں نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے، وہ زیادہ مبنی بر صداقت ہے،

"پنڈت جی کا خیال ہے کہ مسٹر گاندھی نے ذاتی طور پر مسلمانوں کے تمام مطالبات کو اس شرط پر قبول کر لیا تھا کہ آزادی کی جنگ میں مسلمان پوری امداد کا یقین دلائیں اور یہ کہ فرقہ داری سے زیادہ، رجعت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں نے اس شرط کو نہیں مانا، لندن میں جو کچھ ہوا اس کے متعلق مذکورہ بالا بیان بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔

پنڈت جواہر لال نے فرمایا ہے کہ سر آغا خاں مسلمانوں میں سیاسی رجعت پسندی کے سب سے بڑے محرک ہیں۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ خود سر آغا خاں نے میری اور کئی ہندوستانی مندوبین کی موجودگی میں مسٹر گاندھی کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہندو یا کانگریس مسلمانوں کے مطالبے مان لے، تو مسلمانوں کا بچہ بچہ جنگ آزادی میں مسٹر گاندھی کے اشارے پر چلنے کے لئے تیار ہو گا۔ مسٹر گاندھی نے سر آغا خاں کے الفاظ پر کافی غور و خوض کرنے کے بعد مسلم مطالبات منظور کر لینے کی پیشکش کی، جس میں جگہ جگہ شرائط اور قیود تھیں۔

پہلی شرط یہ تھی کہ مسٹر گاندھی مسلمانوں کے مطالبات کو صرف ذاتی طور پر مانیں گے۔ اور بعد ازاں کانگرس سے وہ ان کے مطالبات تسلیم کرانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن وہ اس ضمن میں کوئی حتمی وعدہ نہیں کر سکتے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ کانگرس کی مجلس انتظامیہ کو تار دے کر اپنی پیشکش کی تائید حاصل کر لیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ کانگرس اس مسئلہ میں کبھی انھیں کلی اختیار دینے

کے لئے تیار نہ ہوگی۔

اگر پنڈت جواہر لال نہرو پسند کریں تو مسز سروجنی نائیڈو سے جو اس وقت میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، معلوم کر سکتے ہیں، کہ گاندھی جی کے رویہ کے متعلق انھیں میرے ساتھ اتفاق ہے یا نہیں۔ گاندھی جی سے پھر کہا گیا کہ کم از کم ہندو اور سکھ مندوبین سے ہی وہ اپنی پیش کش کی تائید کرا لیں۔ اس پر گاندھی جی نے کوشش تو ضرور کی، لیکن وہ ناکام رہے اور پرائیویٹ طور پر ان لوگوں کے رویہ کے متعلق مایوسی کا اظہار کر دیا۔

مسٹر گاندھی کی دوسری اور غیر منصفانہ شرط یہ تھی کہ مسلمان، اچھوتوں کے مخصوص مطالبات اور بالخصوص نمائندگی میں خاص مراعات کے مطالبہ کی حمایت نہ کریں۔ اس کے جواب میں مسٹر گاندھی کو بتا دیا گیا، کہ مسلمانوں کے لئے یہ شرط اس لئے قابل قبول نہیں، کہ خود اس قسم کے مطالبات پیش کر رہے ہیں، البتہ اگر مسٹر گاندھی اچھوتوں سے اپنے طور پر اس بارے میں کوئی سمجھوتہ کریں تو مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

لیکن مسٹر گاندھی اپنی شرط پر اڑے رہے، کیا میں دریافت کر سکتا ہوں، کہ اپنے زبان زد عام سوشلسٹ خیالات کے پیش نظر پنڈت جواہر لال نہرو اس انسانیت کش شرط کی کیسے حمایت کریں گے۔؟

یہ ہیں اصل واقعات مسٹر گاندھی اور مسلم مندوبین کے درمیان مذاکرات کے، اس گفت و شنید کی ناکامیابی کی اصل وجہ مسلمان مندوبین

کی سیاسی رجعت پسندی تھی، یا دوسروں کی سیاسی تنگ نظری، اس سوال کا جواب پنڈت جواہر لال نہرو خود ہی دیں۔"

(۳۱)

آغا خاں کی پیش کش

آگے چل کر اقبال نے آغا خاں کی ایک حیرت انگیز پیش کش کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے آغا خاں تک نے جنھیں انگریزوں کا پٹھو کہا جاتا ہے، کس طرح اپنے آپ کو گاندھی جی کے حوالہ کر دیا تھا،

"ہز ہائی نس سر آغا خاں نے دو سال ہوئے جو پیش کش کی تھی، وہ اب تک قائم ہے۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت میں ہندو یا کانگریس مسلمانوں کے ان مطالبات کو جنھیں وہ کل ہند اقلیت ہونے کی حیثیت سے اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں، مان لیں تو مسلمان اب بھی بقول آغا خاں، جنگ آزادی میں ہندوستان کی اکثریت والی قوم کے لشکر کے ساتھ ادنیٰ خدمت گذاروں کی حیثیت سے شریک ہونے کے لئے تیار ہیں، لیکن اگر یہ پیش کش پنڈت جی کو قبول نہیں، تو کم از کم انھیں یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں رجعت پسندی کا ملزم قرار دیں۔ اس صورت میں وہ لوگ جو ہندوؤں کی فرقہ داری کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ پنڈت جی فرقہ دارانہ فیصلہ کے خلاف ہندو مہا سبھا کی جاری کردہ

مہم کے ایک سرگرم رکن ہیں۔"

(۳۲)

قومیت کا اصول کیا ہے

پنڈت جواہر لال نہرو کی الزام تراشی کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے مزید کہا ہے:۔

"مسلمانوں کے خلاف پنڈت جواہر لال نہرو کا دوسرا الزام یہ ہے، کہ ان میں چند لوگ قطعی طور پر اصول قومیت کے منکر ہیں۔ اگر قومیت سے مراد ان کی یہ ہے کہ مختلف مذہبی جماعتوں کو حیاتیاتی معنوں میں ملا جلا کر ایک ایک کر دیا جائے، تو پھر میں خود ہی نظریہ قومیت کے انکار کا مجرم ہوں میرے خیال کے مطابق ہندوستان کے خصوصی حالات کے پیش نظر ان معنوں میں یہاں ایک قوم کی تشکیل ناممکن ہی نہیں بلکہ نامناسب بھی ہے اور پھر ان معنوں میں تو قومیت کے سب سے بڑے مخالف مسٹر گاندھی ہیں۔ جنھوں نے اچھوتوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ مدغم ہونے کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن بنایا ہوا ہے اور جو صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا ایک حصّہ سمجھا جائے، جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، مسٹر گاندھی کا اچھوتوں سے پیغام یہ ہے کہ "ہندو دھرم کو مت چھوڑو، ہندو مت میں رہو، لیکن ہندو بننے کی کوشش نہ کرو"

لیکن ایک ایسے شخص کو جو اصول قومیت کا ان معنوں میں مخالف ہو کہ مختلف مذہبی جماعتیں اپنی انفرادیت نہ کھو بیٹھیں، لازمی طور پر قومیت کا دشمن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اس لئے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے کئی مفاد بدیہی طور پر مشترک ہیں اور جہاں تک ان مشترک مفادات کا تعلق ہے، مختلف جماعتوں میں کسی نہ کسی سمجھوتہ کا امکان موجود ہے۔ بلکہ میرا تو یہ یقین ہے، کہ اس قسم کا سمجھوتہ لازمی طور پر ہو کر رہے گا۔ موجودہ حالات ملک کی سیاسی ترقی کی راہ میں ایک لازمی منزل ہیں۔ ہمیں ایک متحدہ ہندوستان کی بنیاد ٹھوس حقائق پر رکھنی ہوگی، یعنی یہ کہ اس ملک میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔ جتنی جلدی بھی ملک کے سیاستدان واحد قومیت کے خیال کو جس کا مطلب مختلف جماعتوں کو حیاتیاتی طور سے مدغم کرنے کے سوا کچھ اور نہیں، ترک کر دیں، ہم سب کے لئے اسی قدر اچھا ہے۔"

(۳۳)

مسلمان اور جمہوریّت

جواہر لال کے ایک اور خیال کی تردید کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں:-

"پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ بھی خیال معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مذہبی طور تو جمہوریت کے قائل ہیں۔ لیکن عملی طور پر اس سے خائف ہیں، لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جداگانہ انتخاب اور دوسری تمام حفاظتی تدابیر جن پر مسلمان مصر ہیں، ان کا واحد مقصد یہی ہے کہ نسبتاً غریب اور

پس ماندہ جماعت کے آٹھ کروڑ مسلمان جمہوریت کے حقیقی فائدوں سے بالکل محروم نہ کر دیئے جائیں۔ مسلمان حفاظتی تدابیر اس لئے نہیں چاہتا کہ وہ جمہوری نظام سے خائف ہے بلکہ اس لئے کہ وہ جمہوریت کی آڑ میں کسی ایک مذہبی جماعت کے غلبہ سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں ہی جمہوریت کے قیام کا خواہاں ہے۔ خواہ اس کے لئے اسے جمہوریت کی ظاہری شکل ہی قربان کرنا پڑے۔"

(۴۴)

ایک بے بنیاد الزام

آخر میں پنڈت جواہر لال کے ایک بے بنیاد الزام کی تردید کرتے ہوئے اقبال نے کہا:۔

"پنڈت جی نے ہز ہائی نس سر آغا خاں۔ ڈاکٹر شفاعت احمد اور میری ان تقاریر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جو دار العوام کے بہت سے ممبران کے سامنے کی گئی تھیں۔ اس کے متعلق میں صرف اتنا ہی کہوں گا۔ کہ وہ بیانات جو ہماری طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں اس قسم کی دلیل میں ہماری تقاریر کے اصل متن کی بجائے کسی اخباری نمائندہ کے تاثرات کا حوالہ دینا بالکل بے معنی ہے۔ کوئی ہندوستانی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں، کہ ہندوستان میں نظام حکومت انگریز کے بغیر نہیں چل سکتا۔"

(۳۵)

ایک ٹیڑھا سوال

پھر اقبال نے پنڈت جی سے دریافت کیا:۔

"آخر میں مَیں پنڈت جواہر لال سے ایک سیدھا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اکثریت والی قوم دس کروڑ کی اقلیت کے کم سے کم تحفظات کو جنھیں وہ اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھتی ہے نہ مانے اور نہ ثالث کا فیصلہ قبول کرے۔ بلکہ واحد قومیت کی ایسی رٹ لگاتی رہے، جس میں صرف اس کا اپنا ہی فائدہ ہے، اور دوسری اقلیتوں کا سراسر نقصان اور خسارہ، تو پھر ہندوستان کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟ اس سے صرف دو صورتیں نکلتی ہیں یا تو اکثریت والی ہندوستانی قوم کو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مشرق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے برطانوی سامراج کی ایجنٹ بنی رہے گی، یا پھر ملک کو مذہبی، تاریخی، اور تمدنی حالات کے پیش نظر اس طرح تقسیم کرنا ہو گا کہ موجودہ شکل میں، انتخابات اور فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال ہی نہ رہے۔!"

لیکن اس ٹیڑھے سوال کا جواب پنڈت جی کے پاس کوئی نہ تھا۔!

(۳۶)

کانگریس پر اعتراض

کانگرس اگر فرقہ وارانہ فیصلہ کی مخالف تھی، تو اسے چاہیئے تھا، کہ کوئی نعم البدل

پیش کرتی۔ لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ پبلک پلیٹ فارم پر اور مرکزی اسمبلی کے ایوان میں اس فیصلہ کو منسوخ کرانے کا آغاز کر دیا۔ ۱۹ جون ۱۹۳۶ء کو اقبال نے کانگرس کی اس روش پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا:۔

"کانگرس کا دعویٰ ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام مذہبی جماعتوں کی یکساں طور پر نمائندگی کرتی ہے اور چونکہ فرقہ دارانہ فیصلہ کے متعلق ہندوستان میں اختلاف رائے ہے۔ اس لئے نہ وہ اسے تسلیم ہی کرتی ہے، اور نہ اسے نامنظور کرتی ہے۔ لیکن فرقہ دارانہ فیصلہ کے متعلق کانگرس کا تبصرہ انکار ہی کے برابر ہے، حالانکہ اپنے دعویٰ کے مطابق کانگرس کو اس فیصلہ کے متعلق کسی قسم کی رائے کا اظہار نہ کرنا چاہیے تھا۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی نے جان بوجھ کر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے، اگرچہ اس فیصلہ کو قرطاس ابیض میں شامل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ قرطاس ابیض کے دوسرے حصے صرف تجاویز ہیں۔ لیکن فرقہ دارانہ فیصلہ ایک طے شدہ امر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو برطانوی وزیر اعظم نے ان ہی لوگوں کی درخواست پر دیا تھا۔ جو آج اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

اپنی قرارداد میں کانگرس نے اپنی فرقہ دارانہ ذہنیت کو چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن اس فعل نے ان چالوں کو اس طرح بے نقاب کر دیا ہے کہ کوئی مسلمان دھوکے میں نہیں آسکتا۔ اس نازک موقع پر میں مسلمانان ہند کو مشورہ دوں گا کہ گو فرقہ دارانہ فیصلہ میں ان کے تمام مطالبات کو پورا نہیں کیا گیا وہ پامردی کے ساتھ اس کی حمایت کریں

ایک باعمل قوم کی حیثیت سے وہ صرف یہی راہ اختیار کر سکتے ہیں۔"

اقبال کے ان افکار وخیالات کی شدید مخالفت ، کانگریس ، جواہر لال اور ، نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے ہوئی ۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ان کی رائے کتنی صحیح تھی ۔ مسلمان اگر اس رائے کو نہ مانتے تو تباہ ہو گئے ہوتے ۔ اپنی ملی انفرادیت سے محروم ہو گئے ہوتے ، پاکستان صرف ایک خواب رہتا —— ایسا خواب جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا ۔!

کشمیر

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و اسیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر!

پس منظر

کشمیر سے اقبال کو والہانہ تعلق خاطر تھا۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کا تعلق ایک کشمیری خاندان سے تھا، اور ان کے آباو اجداد کشمیر کے رہنے والے تھے، بلکہ اس لئے کہ وہاں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت تھی —— جموں میں بھی اور کشمیر میں بھی —— اور اس اکثریت کو وہاں کی ہندو حکومت انگریزوں کی سرپرستی اور مہاسبھائی پشت پناہی کے بل بوتے پر کچل رہی تھی۔ پامال کر رہی تھی۔ ہلاکت کے غار میں دھکیل رہی تھی۔ کشمیر کے ہنرور اور صناع آج بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن وہ نان شبینہ کو محتاج ہیں۔ اور ہندو سرمایہ دار ان کے ہنر اور صنعت کو کوڑیوں کے مول خرید کر اپنی دولت میں اندھا دھند اضافہ کر رہے ہیں۔ وہاں کی زمین وہاں کے باشندوں (مسلمانوں) کی ہے، لیکن وہاں کی حکومت نے اس زمین کو اپنے حوالیوں موالیوں میں تقسیم کر رکھا ہے، کشمیر کے مسلمان کل تک علم جدید کی دوڑ میں پیچھے تھے، لیکن اب حالت یہ ہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے، اونچی ڈگریاں حاصل کرنے اور ہر طرح کی قابلیت حاصل کرنے کے باوجود سرکاری ملازمت کے دروازے ان پر بند ہیں۔ وہ ذرا صدائے احتجاج بلند کریں، تو ان کی آواز سنگینوں اور بندوقوں سے دبا دی جاتی ہے، وہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، لیکن اکثریت کا احترام اس طرح کیا

جاتا ہے کہ متعدد مسجدیں اور خانقاہیں، حکومت کے قبضہ میں ہیں۔ جہاں نماز نہیں پڑھی جاسکتی، عبادت نہیں کی جاسکتی، وہاں سرکاری دفاتر قائم ہیں۔ وہاں اگر کوئی شخص ہندو سے مسلمان ہوجائے تو اس کی ساری جائداد ضبط کرلی جاتی ہے، اور اس پر عرصۂ حیات تنگ کردیا جاتا ہے۔ گاؤکشی کے جرم میں اگر کوئی مسلمان پکڑا جائے تو پھر اسے ایک طویل مدت کے لئے قید و بند کی مصیبت سہنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ یہ اکثریت اتنی بے بس ہے کہ نہ کابینۂ وزارت میں اسے کوئی دخل ہے، نہ اسمبلی میں اسے مؤثر حیثیت حاصل ہے، گرمی کے موسم میں وہاں "ہندوستان" کے اور دنیا کے مختلف ممالک کے سیاح پہونچتے ہیں، اور وہاں کی غربت، اور فلاکت سے فائدہ اٹھاکر عصمتیں خریدتے ہیں، اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرکے کامیاب و بامراد واپس چلے آتے ہیں۔

اقبال یہ جگر فگار اور دل دوز مناظر دیکھتے ہیں، اور ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں جس خطۂ ارض کے مسلمان، اپنی صلاحیتوں سے ایک نئی دنیا بناسکتے ہیں، جو اپنے ہنر، صنعت، قابلیت، اور ذہانت سے ایک نئی جنت بناسکتے ہیں۔ وہ جنت میں بستے ہوئے، جہنم کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ بے قابو ہوجاتے ہیں۔ کبھی نالۂ موزوں سے بزم و انجمن میں تہلکہ مچادیتے ہیں۔ کبھی اپنی شیوا بیانی اور شعلہ مقالی سے مست خواب لوگوں میں زندگی کی نئی امنگ اور ترنگ پیدا کردیتے ہیں۔ کشمیر کے بارے میں لب کشائی کا انہیں کہیں اور کبھی موقعہ ملے، وہ خاموش نہیں رہ سکتے۔ وہ شعلہ نوائی پر مجبور ہیں،

ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی فریاد سے دنیا تہ و بالا کردیں

اور واقعی جب تک وہ زندہ رہے، یہی کرتے رہے، کشمیر کے بارے میں انہوں نے مسلمانوں کو اکسایا، انگریزوں کو للکارا، ہندوؤں سے مقابلہ کیا، اور خود کشمیریوں میں احساس خودی، اور جذبۂ انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے'؟

کشمیر میں آزادی کی لہر

آخر جب ظلم و استبداد، حد سے گزر گیا، تو کشمیر کے محکوم و مجبور مسلمان کفن سر سے باندھ کر میدان میں اترے، انہوں نے گولیاں کھائیں، جیل گئے، جائدادیں ضبط کرائیں سر اور سینہ پر پولیس کے ڈنڈے کھائے، مگر جادۂ حریت پر استوار رہے۔ یہ حالات دیکھ کر قدرۃً مسلمانان متحدہ ہندوستان میں بھی اضطراب پیدا ہوا، اور یہاں سے حقیقی کشمیری مسلمانوں کی مدد کے لئے جانے لگے۔ مہاراجہ کی حکومت نے انگریزوں کی اعانت سے ظلم و ستم کا کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا۔ لیکن آزادی کی آگ جب بھڑکتی ہے۔ تو وہ ان چھینٹوں سے نہیں بجھتی۔ اس تحریک کا ردّ عمل یہ ہوا کہ ہندوؤں نے ہندوستان اور کشمیر میں فساد کا سلسلہ شروع کر دیا، اور کشمیر کی تحریک کو تحریک عالم اسلام سے ملا دیا، اس سے انگریز بھی خوفزدہ ہو گئے۔

اقبال کا تبصرہ

اقبال نے ان حالات پر، بڑی خوبی سے ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں تبصرہ کیا:۔

"جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے، مجھے ان واقعات کے تاریخی پس منظر میں جانے کی ضرورت نہیں جو حال ہی میں رونما ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کا دفعتاً جاگ اٹھنا جس میں شعلۂ خودی بجھ چکا ہو۔ غم اور مصائب کے باوجود ان لوگوں کے کیلئے مسرت کی بات ہے، جو ایشیائی قوموں کی اندرونی کشمکش سے واقف ہیں۔ کشمیر کی تحریک انصاف پر مبنی ہے اور مجھے کوئی شبہ نہیں کہ اس ذہین اور صناع قوم میں اپنی شخصیت کا احساس نہ محض ریاست بلکہ تمام ہندوستان کے لئے عافیت کا باعث ہوگا۔ البتہ جس چیز کا سب سے زیادہ دکھ ہے۔ وہ ہندوستان کی فرقہ دارانہ مخاصمت ہے۔ جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنے کشمیری بھائیوں سے فطری ہمدردی کا ردعمل یہ ہوا کہ ہندوؤں نے ایک ظالم نظام کے دفاع کی کوشش کی اور سارا الزام پان اسلامی سازش اور کشمیر پر قبضہ کرنے کے برطانوی منصوبوں کے سر پر دھر دیا۔ اس تحریک کے فرقہ دارانہ رنگ کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے، یعنی جبر و تشدد کا قیام اور بدنظمی۔ جموں میں حکومت بالکل بے بس ہے اور جتنا کچھ بھی ہے، برطانوی افواج کی موجودگی کی وجہ سے ہے۔ ریاستی حکام کی شرمناک سفاکی اور استبداد کی خبریں

بدستور آ رہی ہیں۔"

بے نتیجہ تحقیقاتی کمیشن!

کشمیر کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اصلاحات سیاسی کا مطالبہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں :-

"ایسے حالات میں تحقیقاتی کمیشن کا تقرر بھی فضول ہے۔ گلانسی رپورٹ نے اگرچہ اہم واقعات کو تسلیم کر لیا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ان واقعات سے صحیح اور جائز نتائج اخذ نہ کر سکی، لہٰذا مسلمانوں کو اطمینان دلانے میں ناکام رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اب معاملہ ان مراحل سے بہت آگے بڑھ چکا ہے، جہاں معلومات کچھ مدد دے سکتی ہیں۔ تمام دنیا کی قوموں میں احساس خودداری پیدا ہو رہا ہے۔ اور اس احساس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ حکومت میں زیادہ حصہ طلب کریں۔ ایک غیر متمدن قوم کے لئے سیاسی سرپرستی شاید موزوں ہو، لیکن یہ چیز خود حکومت کے مفاد میں داخل ہے کہ جب لوگوں کی اکثریت تبدیلی کا مطالبہ کرے، تو وہ بنیادی تبدیلیوں سے بھی نہ گھبرائے علاوہ ازیں ان باتوں کے جو کشمیر کے غیر معمولی حالات میں رونما ہوتی ہیں، وہاں کے لوگوں کا مجلس عام (POPULAR ASSEMBLY) کا مطالبہ ہے، ہمیں بھروسہ رکھنا چاہیئے کہ مہاراجہ صاحب اور حکومت ہند ان کے مطالبات کو ہمدردی سے دیکھیں گے اور مجھے یقین ہے کہ نیا وزیر اعظم ایک قابل لیکن مظلوم قوم کو ابھرنے کا موقع دے گا، جس

نے زمانۂ قدیم کو چند بہترین دماغ عطا کئے ہیں۔ دستوری اصلاحات کی راہ میں باقی ملک کی طرح کشمیر میں بھی رکاوٹیں ہوں گی۔ لیکن امن اور نظم کی بہتری اسی میں ہے کہ ان مشکلات پر قابو حاصل کیا جائے۔"

کشمیر میں ظلم و تشدد اور فتنہ و فساد کا دور

مسلمانانِ کشمیر کی بیداری اور مسلمانانِ ہند کی پشت پناہی نے حالات کو فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچا دیا تھا۔ حکومتِ ہند نے کرنل کالون کو وزیر اعظم بنا کر بھیجا کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ وہاں کے حالات سدھارنے کی کوشش کریں۔ لیکن، مہاراجہ اور ان کے رفقا اس پر تلے ہوئے تھے کہ کسی طرح حالات سدھرنے نہیں دیں گے اور کسی ایسی تدبیر کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے، جس سے، مسلمانانِ کشمیر کی فلاح و صلاح وابستہ ہو۔

چنانچہ ایک طرف تو، کشمیر میں، خون ریز ہندو مسلم فسادات کا سلسلہ جاری کرایا گیا۔ دوسری طرف، مسلمانانِ کشمیر کے ہر دل عزیز اور مقبول عوام رہنماؤں، میر واعظ اور شیخ عبداللہ کو بغیر کسی معقول وجہ کے گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح حالات اور زیادہ ابتر ہو گئے۔ کشمیر بھر میں بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانانِ کشمیر کو آپس میں لڑانے کی تدبیریں بھی شروع ہو گئیں۔ ان حالات سے اقبال بہت متاثر ہوئے،

اقبال کا بروقت انتباہ

۷ جون ۱۹۳۳ء کے ایک پبلک بیان میں اقبال نے کہا:۔

"کشمیر گورنمنٹ کے تازہ ترین اعلامیہ میں بتلایا گیا ہے کہ سری نگر میں

اب حالات پُرسکون ہیں، لیکن جو اطلاع مجھے معتبر ذرائع سے ملی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ حالات اتنے اچھے نہیں ہیں، جتنے کہ سرکاری اعلامیہ میں بتائے گئے ہیں۔ میرا تو خیال یہ ہے کہ خود حکومت کشمیر کے ارکان میں ایسے لوگ موجود ہیں، جو کرنل کالون کی پالیسی کو ناکام بنانے کی کوشش میں ہیں؛

حکومت کشمیر کے ایک تازہ اعلامیہ میں دنیا کو بتایا گیا ہے کہ مسلم جماعتوں کے لیڈروں کی گرفتاری کابینہ کے متفقہ فیصلہ کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی، ایک معتبر خبر کے ذریعہ جو مجھے اپنے طور پر موصول ہوئی ہے، اس بیان میں کوئی صداقت نظر نہیں آتی!"

پھر حکومت کشمیر کی سفاکی، درندگی اور بربریت کے لرزہ انگیز واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:۔

"میں کشمیر کی کسی سیاسی جماعت کی بلا وجہ حمایت نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن دونوں جماعتوں کے لیڈروں کی گرفتاری، لوگوں پر ڈنڈوں کی بارش، اور عورتوں پر بچوں پر گولی چلانا اور لاٹھی چارج، ایسے واقعات ہیں، جو کشمیر کو پھر ان مصیبتوں میں ڈال دیں گے، جن سے کرنل کالون نے اپنی حکمت عملی سے نجات دلائی تھی۔ مجھے امید ہے کہ کشمیر گورنمنٹ موجودہ واقعات کا نفسیاتی پس منظر معلوم کرنے کی کوشش کرے گی، اور ایسا رویہ اختیار کرے گی جس سے ریاست میں امن اور آشتی کا دور دورہ ہو جائے!"

صائب مشورہ

ہندوستان کی طرح کشمیر میں بھی مسلمانوں کی متعدد جماعتیں موجود تھیں۔ اور یہ دشمن سے زیادہ خود آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ اقبال نے اس صورت حال کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسلمانانِ کشمیر کو ہدایت کی کہ وہ کوئی ایک منظم سیاسی ادارہ قائم کریں:۔

"میں مسلمانانِ کشمیر سے استدعا کرتا ہوں، کہ وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو ان کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ اور اپنے درمیان اتفاق اور اتحاد پیدا کریں۔ کشمیر میں ابھی بیک وقت دو یا تین اسلامی سیاسی جماعتوں کے کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے، کہ ریاست میں مسلمانوں کی نمائندہ صرف ایک ہی جماعت ہو۔"

کشمیر کمیٹی

مسلمانانِ کشمیر کی امداد و اعانت کے لئے کئی جماعتیں، پنجاب میں بن گئی تھیں ایک تو مجلس احرار تھی۔ دوسری وہ کشمیر کمیٹی تھی، جس میں قادیانی اصحاب بھی شریک تھے اور غالباً مرزا البشیر الدین محمود صاحب اس کے صدر تھے۔ ایک اور کشمیر کمیٹی کے صدر اقبال تھے۔ ان کمیٹیوں اور مجلسوں نے اگر باہمی تعاون اور اشتراک سے کام کیا ہوتا تو شاید کشمیر کے مسلمانوں کی، ٹھوس خدمت بجا لائی جاتی۔ لیکن کشمیر کی طرح یہاں بھی آپس کی بدمزگی اور بدگمانی بڑھتی گئی۔ جو لوگ کشمیر کے لئے متعصبوں اور ظالموں سے لڑنے کے لئے میدان میں اترے تھے وہ خود آپس ہی میں دست و گریباں ہو گئے۔ اسلامی ہند کی سیاست کا

یہ بڑا عبرت انگیز اور المناک باب ہے۔

اقبال کا ایک اہم بیان

اس موقع پر ایک طرف تو اقبال نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا، دوسری طرف عوام کو اعتماد میں لیتے ہوئے انھوں نے صورتِ حال کی بھی وضاحت کر دی اور بتا دیا کہ پس پردہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ۲۰ جون ۱۹۳۳ء کے ایک بیان میں فرمایا:۔

"کشمیر کمیٹی میں میری صدارت محض عارضی تھی، کمیٹی کی تشکیل، کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رونما ہونے پر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لئے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا، اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے تھے۔

یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہوگی ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کر دیا۔ لہٰذا بعض سے ممبران نے یہ سوچا کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہئے اور عہدیداروں کا نیا انتخاب ہونا چاہیے۔ کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریق کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلاف نے جس کے اسباب کا یہاں ذکر مناسب نہ ہوگا اس خیال کی مزید تائید کی۔ چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا، جس میں کمیٹی کے صدر نے اپنا استعفےٰ پیش کر دیا، پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسودہ پیش کیا گیا جس کی

غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو۔ لیکن ممبران نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ البتہ بحث مباحثہ اور گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہوگا۔ چنانچہ میں نے اپنا استعفیٰ پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔"

قادیانی حضرات کا طرزِ عمل

اس بیان میں اقبال نے قادیانی حضرات کے طرزِ عمل پر بھی بڑی سبق آموز نکتہ چینی کی ہے:۔

"بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں ایک صاحب نے جو میرپور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے، حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے۔ اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا بھی یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔

میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے

حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے۔ کشمیر کمیٹی کی عام پالیسی کے متعلق ممبران میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے پالیسی سے اختلاف کی بنا پر کسی نئی پارٹی کی تشکیل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا۔ لیکن جہاں تک میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ کشمیر کمیٹی کے چند ارکان کو جو اختلافات ہیں۔ وہ بالکل بے تکے ہیں۔"

کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے

حالات کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد اقبال نے رائے دی کہ:۔

"ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے۔ کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔"

نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کا مشورہ

لیکن اقبال اس خیال کے حامی تھے، کہ ایک نئی کمیٹی بنائی جائے، جو نئے عناصر پر مشتمل ہو:۔

"ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ مسلمانان کشمیر کی رہنمائی اور مدد کے لئے، برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیئے۔ اس

لئے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجاز ہیں کہ ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کریں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔"

گلانسی کمیشن کے سفارشات

حکومتِ ہند کے مقرر کردہ گلانسی کمیشن نے کشمیر کے سیاسی اصلاحات سے متعلق جو رپورٹ شائع کی، اگرچہ مسلمانوں کے مطالبات اس میں پورے طور پر منظور نہیں کئے گئے تھے، پھر بھی کسی حد تک اشک شوئی کی کامیاب کوشش ضرور تھی۔ اقبال نے ابتدائی قدم کے طور پر اس کا خیر مقدم کیا۔ ۲۔ اگست ۱۹۳۳ء کے ایک بیان میں فرمایا:۔

"ہندوستان کے لوگ اس اعلامیہ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ امید ہے کہ گلانسی کمیشن کی سفارشات پر بہت جلد عمل شروع ہو جائے گا اور اس طرح حکومت کشمیر ان لوگوں کے دلوں میں جن کے لئے یہ اصلاحات منظور کی گئی ہیں۔ اپنا اعتماد پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس مقصد کے لئے راجا اور پرجا میں صلح اور آشتی کا ماحول ہونا نہایت ضروری ہے۔ حکومت کے لئے لازمی ہے کہ رعایا کے ساتھ ایسا سلوک کرے، کہ لوگوں میں حکومت کی طرف سے کسی قسم کی غیریت اور بیگانگی کا احساس پیدا نہ ہو، بلکہ وہ یہ سمجھیں کہ حکومت ہماری اپنی ہے اور اس سے اپنا ہر جائز مطالبہ پورا کرنے کی توقع رکھیں۔"

مدبرانہ مشورہ

آخر میں فرمایا:۔

"وزیر اعظم کشمیر مسٹر کالون کو میں یہ مشورہ دوں گا، کہ حکومت اور عوام میں دوبارہ اعتماد اور اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لئے وہ میرپور اور بارہ مولا میں زیر سماعت فوجداری مقدمات کو واپس لے لیں۔ یہ اقدام حکومت کشمیر اور وزیر اعظم کے وقار کو بڑھانے میں بہت مؤثر ثابت ہوگا اور اس طرح وہ پروپیگنڈا بھی بند ہو جائے گا، جو آجکل وزیر اعظم کے خلاف ہو رہا ہے۔!"

لیکن.....!

لیکن، وہ نہ ہوا جو اقبال چاہتے تھے۔ برطانوی استعمار، اور رسندہ سامراج کی سازش اپنا کام کرتی رہی۔ میر واعظ اور شیخ عبداللہ کی جنگ زرگری جاری رہی کشمیر کے معصوم و مجبور مسلمان ظلم کی چکی میں پیسے جاتے رہے۔ اقبال کا عمل گو اس پر رہا کہ

فریاد و فغاں بلبل ناشاد کئے جا،

لیکن نہ کسی نے ان کی فریاد سنی، نہ فغاں۔ وہ بے بسی کے ساتھ یہ جگر خراش منظر دیکھتے رہے اور اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے؟

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کیے

آشیاں لٹتا رہا، ہم ناتواں دیکھا کیے

قادیانیت

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بُود!
حدیثِ اُو ہمہ تخمین و ظن بُود!
ہنوز اِسلام اُو زنّار دار است
حرم چوں دیر بُود او برہمن بُود!

○

بہ منزل کوش مانندِ مہِ نو!
دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شو!
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ رَو!

○

ایک خالص دینی اور علمی مسئلہ

اسلام اور قادیانیت مسلمان اور قادیانی ایک خالص دینی اور علمی مسئلہ ہے۔ اس پر اسی حیثیت سے بحث و گفتگو ہونی چاہیے بدقسمتی سے اس مسئلہ کو جذباتی بنا لیا گیا جس سے عوام متاثر بھی ہوئے اور مشتعل بھی۔ پھر اس کے نتیجہ میں ہنگامہ آرائیاں اور فساد انگیزیاں بھی ہوئیں۔ قتل و غارت اور کشت و خون کے مناظر بھی لوگوں نے دیکھے چنانچہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ان حرکتوں کے باعث یا تو سرے سے مذہب سے بیزار ہو گیا۔ یا کم از کم مسئلہ کو اس نے کوئی اہمیت نہیں دی اور

دین ملّا فی سبیل اللہ فساد

کہہ کر خاموش ہو گیا۔

لیکن حقیقتاً یہ بات یوں نہیں تھی۔ یہ ایک بے انتہا اہم اور بنیادی مسئلہ ہے۔ فکر و نظری اعتبار سے بھی، فقہی اور کلامی نقطۂ نظر سے بھی، اجتماعی اور انفرادی حیثیت سے بھی ضرورت تھی کہ اس مسئلہ پر جذبات سے ہٹ کر پوری سنجیدگی کے ساتھ علمی اور کلامی انداز میں بحث کی جاتی۔ اقبال نے اس تحریک

کی ساری تاریخ میں بالکل پہلی مرتبہ یہی روش اختیار کی۔ انہوں نے کوئی نعرہ نہیں لگایا بلکہ قادیانیوں کے ساتھ رواداری اور حسن سلوک کی تاکید کی۔ لیکن اس کے باوجود بڑی سنجیدگی اور ساتھ ہی ساتھ ژرف نگاہی، تحقیق، وسعت نظر اور وسعت مطالعہ کے ساتھ اس کے مالہٗ وما علیہ پر نظر ڈالی۔

سب سے پہلا بیان

اس سلسلہ میں ان کا سب سے پہلا بیان غالباً اسٹیٹمین (STATE-MAN) میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ اس بہت زیادہ طویل بیان میں انہوں نے اپنا دل، اپنا دماغ کھول کر رکھ دیا ہے۔ چونکہ اختصار کلام مدّنظر ہے اس لیے سمندر کے چند قطروں پر قناعت کرنی پڑے گی۔ لیکن یہ قطرے اپنی وسعت معنی میں کسی طرح سمندر سے کم نہیں ثابت ہوں گے۔

اسلامی وحدت کی بنیاد ختم نبوّت ہے

اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان جو مابہ الامتیاز ہے اس پر بحث و گفتگو کرنے کے بعد اقبال نے ایک نکتۂ دل آویز بڑے لطیف پیرایہ میں پیش کیا ہے یعنی یہ کہ اسلامی وحدت کی بنیاد ختم نبوّت پر قائم ہے۔

"ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذاہب بستے ہیں اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے کیونکہ ان مذاہب

کی بنا کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی۔ اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے۔ اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پہ رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے اس لیے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف ہے۔ اس لیے مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہیں جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور سے اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نبوت پہ رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پہ اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا۔ اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔!"

نبوّت کے تسلسل کا نظریہ مو ابدانہ تمدّن کا نتیجہ ہے

آگے چل کر اس سلسلہ میں اقبال نے ایک بڑی عالمانہ بات کہی ہے جو ان کی وسعت علم و تحقیق کا نتیجہ ہے:-

"انسانی تمدن کی تاریخ میں غالباً ختم نبوت کا تخیل سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے مو ابدانہ تمدن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ مو ابدانہ تمدن میں زرتشت۔ یہودی۔ نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوت کے اجرا کا تخیل نہایت لازم تھا۔ چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیت طاری رہتی

بھی موبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہوتی رہیں اور ان کی جگہ مذہبی عیّار نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک رشتہ میں پرو دینے کا دعویٰ رکھتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لئے مزید افتراق کا باعث ہو۔!

بھائیت اور قادیانیت

پھر اقبال نے بتایا ہے کہ اس موبدانہ تمدن کے نمونے اگر اسلام میں تلاش کرتا ہوں تو بھائیت اور قادیانیت میں بڑی آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں:۔

"اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے (بھائیت اور قادیانیت) میرے نزدیک ان میں بھائیت قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے۔ لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے۔ لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں اس کا نبی کے متعلق بجومی کا تخیل اور اس کا درجہ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے لئے

عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ روح مسیح کا تسلسل یہودی باطنیت کا جز ہے۔ پولی مسیح بال شیم (BEAL SHEM) کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بوبر (BOBER) کہتا ہے کہ مسیح کی روح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے واسطہ سے زمین پر اتری۔"

مسئلہ کا بہترین حل

اقبال کے ان خیالات پر مدح و تحسین کے ساتھ ہی ساتھ نکتہ چینی اور مخالفت کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اقبال نے پھر لب کشائی کی اور مسئلہ کا آخری اور بہترین حل پیش کر دیا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بہ جبر انسداد کرے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پالیسی مذہبی جماعتوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ اگرچہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں جنہیں خطرہ محسوس ہو۔ انہیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی میرے رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہو گا کہ وہ قادیانیوں

کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے ۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا۔ اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے !"

الہام پر بحث

اقبال کے ان خیالات پر قادیانی پریس نے سختی اور درشتی سے نکتہ چینی کی، لاہور کے ایک ہفتہ وار اخبار (LIGHT) نے تو نکتہ چینی کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اقبال "امام" پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ ظاہر ہے یہ اقبال پر بہت بڑی تہمت تھی۔ انہوں نے اس کا جواب دیا اور اپنے بیان صفائی میں ارشاد فرمایا۔

"لائٹ" نے اپنے الزام کی بنیاد میرے اس شعر پر رکھی ہے۔

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پہ مٹا ہوا ہوں میں

یہ سلیس اردو ہے جس کا مطلب محض یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں ہم کلامی سے آگے بھی ایک منزل ہے۔ لیکن شعر کو وحی کے دینی معانی سے کچھ تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں لائٹ کی توجہ اپنی کتاب "تشکیل نو"[ؔ] کی طرف مبذول کراؤں گا جہاں صفحہ ۱۲۱ پہ میں نے لکھا ہے کہ احساس اور تخیل کے فطری رشتہ سے وحی کے متعلق اس

[ؔ] "اسلامی فکر کی تشکیل نو" مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس

اختلاف پر روشنی پڑتی ہے جس نے مسلم متکلمین کو کافی پریشان کیا تھا۔ غیر واضح احساس اپنے منتہا کو تخیل کے اندر پاتا ہے۔ اور خود تخیل لباس مجاز میں آنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ہے کہ تخیل اور لفظ دونوں بیک وقت بطنِ احساس سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ اوراک انہیں ایک دوسرے سے مختلف قرار دے کر اپنے لیے دشواری پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح ایک معنی میں لفظ بھی الہام ہوتا ہے!"

اقبال اور حدیث

لائٹ نے اقبال پر یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ وہ گویا حدیث نبوی کو نہیں مانتے جس کی رو سے ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد کے ظہور کی بشارت دی گئی ہے۔

اقبال نے اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا۔ انھوں نے فرمایا:۔

"مدیر "لائٹ" نے ایک ایسی حدیث کا حوالہ دیا ہے جو تاریخی عمل کی نہایت حسابی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں اگرچہ انسان کے روحانی امکانات اور روحانی آدمیوں کی پیدائش کا قائل ہوں تاہم مجھے یہ یقین نہیں کہ اس تاریخی عمل کا حساب ویسے ہی لگایا جا سکتا ہے جیسے "لائٹ" کا خیال ہے۔ ہم بہ آسانی اعتراف کر سکتے ہیں کہ تاریخی عمل کا شعور ہماری فہم سطح سے بہت بلند ہے۔ میں منفی رنگ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس طرح

مقرر اور حسابی نہیں ہے جیسے "لائنٹ" نے سمجھا ہے۔ میں ابن خلدون کی رائے سے بہت حد تک متفق ہوں۔ جہاں وہ تاریخی عمل کو ایک آزاد تخلیقی تحریک تصور کرتا ہے نہ کہ ایسا عمل جو پہلے سے متعین کیا جا چکا ہو۔ موجودہ دور میں برگسان نے اسی نظریہ کو زیادہ صحت اور عمدہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ لائنٹ نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ غالباً جلال الدین سیوطی نے مشہور کی تھی اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ بخاری و مسلم میں اس حدیث کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس میں چند بزرگوں کے تاریخی عمل کے نظریہ کی جھلک ہو تو ہو لیکن افراد کے ایسے رویا کوئی دلیل نہیں بن سکتے۔ تمام محدثین نے اسی اصول کی پیروی کی ہے"

ایک استفسار اور اُس کا جواب

اقبال سے الہام، اور وقتاً فوقتاً مصلحین و مجددین کی آمد کے بارے میں استفسار کیا گیا۔ حسب معمول اس مسئلہ کی بھی انہوں نے بڑی خوبی سے وضاحت کی:۔

اس سوال کا جواب "تشکیل نو" کے حوالہ سے بہتر دیا جا سکے گا جو ص ۱۲۱، ص ۱۲۵ پر مرقوم ہے۔

"ختم نبوت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ زندگی کی انتہا بس یہ ہو کہ عقل جذبات (EMOTIONS) کی قائم مقام ہو جائے۔ یہ چیز نہ ممکن ہے نہ تحقق۔ اس عقیدہ کی اصل افادیت اتنی ہے کہ اس سے باطنی واردات

کو آزاد تنقیدی رنگ ملتا ہے۔ کیونکہ اس یقین سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی تاریخ میں فوق الفطرت سرچشمہ کا منصب ختم ہو چکا۔ یہ یقین ایک نفسیاتی قوت ہے جو ایسے منصب کی پیدائش کو روکتا ہے۔ اور اس خیال سے انسان کے اندرونی تجربات میں علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے لا الٰہ فطرت کی تمام قوتوں سے الوہیت کا لباس اتارتا ہے اور انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی روح پیدا کرتا ہے۔ باطنی واردات، خواہ کتنی غیر فطری اور غیر معمولی ہوں مسلمانوں کے لیے بالکل فطری تجربہ ہے۔ جو دوسرے تجربات کی طرح تنقید کی زد میں آتا ہے۔ اور یہ چیز رسول کریم کے رویہ سے اور بھی روشن ہو جاتی ہے۔ جو انہوں نے اس سنفی نفسیاتی واردات کے لیے اختیار فرمایا۔ اسلام میں تصوف کا مقصد انہی باطنی واردات کو منظم کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابن خلدون ایک ایسا شخص گذرا ہے جس نے اسے اصولی طریقے پر جانچا۔ نفسیاتی معنی میں اولیاء یا ان جیسی صفات کے لوگ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ مرزا صاحب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں یا نہیں۔ جب تک عالم انسانیت روحانی اہلیتیں برداشت کر سکتا ہے۔ ایسے لوگ تمام قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوں گے تا کہ وہ انسانی زندگی کی بہتر اقدار کا پتہ دے سکیں۔ اس کے خلاف قیاس کرنا تو انسانی تجربہ کو جھٹلانا ہو گا۔ فرق محض اس قدر ہے کہ اب ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کے باطنی واردات پر تنقیدی نظر ڈال

سکے اور باتوں کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ روحانی زندگی میں جس کے انکار کی سزا جہنم ہے۔ ذاتی سند ختم ہو چکی ہے۔"

اسٹیٹسمین کا اعتراض اور اس کا جواب

قادیانیت، اور اسلام سے متعلق اقبال کے خیالات و افکار کو مشہور انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین (STATES MAN) نے نمایاں طور پر شائع کیا تھا۔ لیکن اقبال کے خیالات اور خاص طور پر اس خیال سے کہ قادیانی حضرات کو عام مسلمانوں سے الگ قوم یا اقلیت قرار دے دیا جائے، اپنے ادارتی کالم میں سخت اختلاف کا اظہار کیا تھا۔

اقبال مخالفت سے گھبراتے نہیں تھے، اس کا خیر مقدم کرتے تھے۔ اور اگر وہ معقول اور سنجیدہ ہو تو اس کا جواب بھی دیتے تھے۔ اور افہام و تفہیم میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسٹیٹسمن کی نکتہ چینی کا خیر مقدم کیا اور اس کی غلط فہمی (اسٹیٹسمین ۱۰ رجون ۱۹۳۵ء) رفع کرنے کی کامیاب اور مدلل کوشش بھی کی ہے۔

"جو سوال آپ نے اپنے مضمون میں اٹھایا ہے۔ وہ فی الواقع بہت اہم ہے۔ اور مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اس سوال کی اہمیت کو محسوس کیا۔ میں نے اپنے بیان میں اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ کیوں کہ میں سمجھتا تھا کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انہوں نے

مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے۔ خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلاف کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے، اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں۔ مجھے اس احساس میں حکومت کے سکھوں کے متعلق رویہ سے اور بھی تقویت ملی جو سکھ ۱۹۱۹ء کے بعد آئینی طور پر علیحدہ جماعت تصور کر لیے گئے، حالانکہ انہوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں۔ اب چونکہ آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے میں چاہتا ہوں اس مسئلہ کے متعلق جو برطانوی اور مسلم دونوں کے زاویہ نگاہ سے بہت اہم ہے۔ چند معروضات پیش کروں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کروں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے۔ تو اسے کس حد تک گوارا کیا جا سکتا ہوں۔ سو عرض ہے:۔

(۱)

مُسلم اَور غیر مُسلم کے درمیان حدِ فاصل

اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں۔ یعنی وحدت الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان، اور رسولِ کریم کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ اور اس امر کے لیے فیصلہ کن

ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں۔ لیکن انہیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور رسول کریمؐ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ایک الگ جماعت ہیں، اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا۔ لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریمؐ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر وہ ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ اُن کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو، تاکہ انہیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔"

(۲)

دُنیائے اِسلام کا فرض

"ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ بانیٔ تحریک نے ملت اسلامیہ

کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں اُن کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کی نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں کا بائیکاٹ، اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کر دینا کہ اسلام کافر ہے، یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اتنے ہی دور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندو مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔"

(۳)

جداگانہ سیاسی حیثیت سے گریز کیوں؟

"اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں۔ تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے ساتھ شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو ۵۶۰۰۰ ہے، انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں مل سکتی، اور اس کے لیے انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت

کا مطالبہ نہیں کیا کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ مجالس قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں قادیانی کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گذرے گا کہ حکومت اس بیے علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ قادیانی ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکیں۔ حکومت نے ۱۹۱۹ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا۔ اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کا کیوں انتظار کر رہی ہے؟"

پنڈت نہرو کی طرف سے اقبال کی مخالفت

جب اقبال نے مسئلہ قادیانیت پر اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ان کی مخالفت میں پنڈت نہرو نے کلکتہ کے رسالہ (MODERN REVIEW) میں مسلسل تین مقالات لکھے اور اپنے خیال میں اقبال کا رد کیا۔ لیکن اقبال نے پنڈت جی کی طرح جذبات سے ذرا بھی کام لیے بغیر بڑی قابلیت سے ان کے خیالات کا تجزیہ کیا پھر اس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ نمونۃً چند ٹکڑے :-

"میرے لیے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ پنڈت جی کو مشرق کے، بلکہ ساری دنیا کے ایک عظیم الشان مسئلے سے جو دلچسپی ہے، میں اس کا خیر مقدم

کرتا ہوں۔ میری رائے میں پنڈت جی پہلے قائد ہیں جنھوں نے دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس بے چینی کے مختلف پہلوؤں اور ممکن رد عمل کے مدّ نظر ہندوستان کے ذی فکر سیاسی قائدین کو چاہیئے کہ اس وقت قلب اسلام میں جو چیز ہیجان پیدا کر رہی ہے۔ اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

پنڈت نہرو کی ذہنیت

سب سے پہلے اقبال نے پنڈت جواہر لال کی ذہنیت کو پرکھنے کی کوشش کی ہے:۔

"میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک درد ناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں۔ میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ بالکل خلوص پر مبنی ہیں۔ تاہم جس طریقہ سے انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ جس کو پنڈت جی کی طرف منسوب کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا۔ (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان

ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں
مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ
ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت
نے احساسِ حقائق کو کچل ڈالا ہے۔ اس بات کو گوارا نہیں کرتے
کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساسِ خود مختاری پیدا ہو
میری رائے میں ان کا خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے
لیے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیے۔ حالانکہ ان تہذیبوں
کے باہمی عمل و اثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائیدار تہذیب
کو نمو دے سکتا ہے۔ ان طریقوں سے جو تہذیب نمو پائے گی اس
کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہو گا؟ یہ بات بھی بدیہی
ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے
ہیں۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی نفوذ کی
ترقی سے ان کا مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبرِ عرب کی امت
سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی اُمت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے
کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کر دوں کہ
ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں اُن کا اندرونی
استحکام کس قدر ضروری ہے، اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا
کس قدر ناگزیر ہے، جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں
پنڈت جی کو یہ موقع دیتی ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔"

امرِ تنقیح طلب

پھر اقبال نے ایک تنقیح طلب معاملہ کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے :۔

"بہر کیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری رکھنا نہیں چاہتا۔ جو لوگ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کے طرز عمل کی توضیح چاہتے ہیں، اُن کے استفادہ کے لیے ڈیورنٹ کی کتاب "افسانۂ فلسفہ" کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جس سے قارئین کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ قادیانیت میں امر تنقیح طلب کیا ہے۔ ڈیورنٹ نے فلسفی اعظم اسپانوزا کے جماعت بدر کئے جانے سے متعلق یہودی نقطہ نظر کو اختصار کے ساتھ چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس اقتباس کے پیش کرنے سے میرا مطلب اسپانوزا (SPINOZA) اور بانی احمدیت میں کسی قسم کا موازنہ کرنا ہے۔ عقل و سیرت کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین بعد عظیم ہے۔ "خدا پرست" اسپانوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی جدید تنظیم کا مرکز ہے۔ اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائے یہودیت سے خارج ہے۔ اسپانوزا کے جماعت بدر کئے جانے کے متعلق ڈیورنٹ کی عبارت یہودیوں کے طرز عمل پر اس قدر منطبق نہیں ہوتی۔ جس قدر کہ قادیانیت کے متعلق مسلمانوں کے طرز عمل پر ہوتی ہے۔

ایک بے بنیاد اعتراض

پنڈت نہرو کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں :-

"پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ جو جماعت مذہبی اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔ وہ محکمہ احتساب کے قیام کو متلزم ہے۔ تاریخ مسیحیت کے متعلق یہ بات صحیح ہو سکتی ہے، لیکن تاریخ اسلام پنڈت جی کی منطق کے خلاف یہ ثابت کرتی ہے کہ حیاتِ اسلامی کے گذشتہ تیرہ سو سال میں اسلامی ممالک محکمہ احتساب سے بالکل ناآشنا رہے۔ قرآن واضح طور پر ایسے ادارے کی مخالفت کرتا ہے "دوسروں کی کمزوریوں کو تلاش نہ کرو اور بھائیوں کی چغلی نہ کھاؤ"۔ پنڈت جی کو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہودی اور عیسائی اپنے ہم مذہبوں اور ہم وطنوں کے مذہبی تشدد سے تنگ آ کر اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے۔ جن دو قضایا پر اسلام کی تعقلی عمارت قائم ہوتی ہے وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں الحاد ناممکن ہے جس سے ملحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یہ سچ ہے کہ جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظام اجتماعی خطرہ

سلے، قرون وسطیٰ میں (INQUISITION) کے نام سے ایک محکمہ قائم ہوا تھا جو لوگوں کے عقاید مذہبی کی تحقیق وتفتیش کرتا تھا۔ برونو (BRUNO) وغیرہ ایسے علماء سائنس کو اس محکمہ نے نذرِ آتش کیا۔

میں پڑ جاتا ہو۔ تو ایک آزاد اسلامی ریاست کا فعل سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہو گا نہ کہ خالص مذہبی اصولوں پر۔ میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ پنڈت جی ایسا شخص جس کی پیدائش اور تربیت ایک ایسی جماعت میں ہوئی ہو جس کی سرحدیں متعین نہیں ہیں، اور جس میں اندرونی استحکام بھی مفقود ہے، اس امر کا مشکل اندازہ کر سکتا ہے کہ ایک مذہبی جماعت ایسے محکمہ احتساب کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے، جو حکومت کی جانب سے عوام کے عقائد کی تحقیقات کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ یہ بات کارڈنل نیومن کی اس عبارت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے جسے پنڈت جی پیش کر کے حیرت کرتے ہیں کہ میں کارڈنل کے اصولوں کو کس حد تک اسلام پر قابل اطلاق سمجھتا ہوں۔ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی اندرونی اور ترکیبی ہیئت اور کیتھولک مسیحیت میں اختلاف عظیم ہے۔ اسلام کے برعکس کیتھولک مسیحیت کی پیچیدگی اس کی فوق العقلی نوعیت اور تحکمی عقاید کی کثرت ہے جیسا کہ تاریخ مسیحیت سے ثابت ہوتا ہے۔"

قادیانیت کے دو گروہ

اقبال لاہوری اور قادیانی جماعتوں کو بھی زیر بحث لاتے ہیں :-

"یہ سوال کہ الحاد کبیرہ کس کو کہتے ہیں اس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی متکلم یا مصلح کی تعلیم مذہب اسلام کے سرحدوں پر

اثر انداز ہوتی ہے ۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیم ایسی ہی ہے ۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ تحریک احمدیت دو جماعتوں میں منقسم ہے جو قادیانی اور لاہوری جماعت کے نام سے موسوم ہیں اول الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا بہرحال یہ سوال کہ آیا بانی احمدیت ایک نبی تھا اور اس کی تعلیم سے انکار کرنا " الحاد کبیرہ " کو مستلزم ہے ان دونوں جماعتوں میں متنازعہ فیہ ہے ! احمدیوں کے ان گھریلو مناقشات کے محاسن کو جانچنا میرے پیش نظر مقصد کے لیے ضروری ہے ۔ میرا یقین ہے (جس کے وجوہ میں آگے چل کر بیان کروں گا) کہ ایسے نبی کا تصوّر جس کے انکار کرنے سے منکر خارج از اسلام ہو جاتا ہے احمدیت کا ایک لازمی عنصر ہے اور لاہوری جماعت کے معاملہ میں قادیانیوں کے موجودہ پیشوا کی تحریک احمدیت کی روح سے بالکل قریب ہے ۔ !"

ختمِ نبوّت کی ثقافتی قدر و قیمت

"ختم نبوت کے تصوّر کی ثقافتی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے ۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں ۔ محمد صلعم کے بعد جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کیا ہے جو ضمیر انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے ۔ ایسی آزادی کا نمونہ دکھایا ہے

کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے دینیاتی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں مکمل اور ابدی ہے محمد صلعم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے۔ جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک احمدیت کا بانی الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالمِ اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانی احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے، یہ ہے۔ کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے۔ لیکن آپ اس سے پھر پھر دریافت کریں کہ محمد صلعم کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ "محمد صلعم آخری نبی نہیں میں آخری نبی ہوں"۔ اس امر کے سمجھنے کی بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوع انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا ثقافتی قدر رکھتا ہے بانی احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد صلعم کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا خود محمد صلعم کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی

روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔[۱]"

احمدیت کی رُوح اور ماخذ

جیسا کہ ہم نے شروع میں عرض کیا تھا۔ اقبال نے اس مسئلہ پر جذباتی حیثیت سے نہیں خالص علمی انداز میں گفتگو کی ہے۔ چنانچہ احمدیت کی روح اور اس کے ماخذ کے سلسلے میں کہتے ہیں:۔

"اب احمدیت کی روح پر غور کرنا چاہیے اس کے ماخذ اور اس امر کی بحث کہ قبل اسلام مجوسی تصورات نے اسلامی تصوف کے ذریعہ بانی احمدیت کے ذہن کو کس طرح متاثر کیا؟ لیکن میرے لیے اس بحث کو اٹھانا ممکن نہیں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرون وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کے نقاب میں پوشیدہ ہے علماء ہند نے اس کو محض ایک دینیاتی تحریک تصور کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔

میرا خیال ہے کہ اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ طریقہ موزوں نہیں تھا اور اسی وجہ سے علماء کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی بانی احمدیت

کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا موثر
طریقہ ہو گا جس کے ذریعہ سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی
کا تجزیہ کر سکیں گے اس سلسلہ میں میں اس امر کو واضح کر دینا چاہتا
ہوں کہ مولوی منظور الٰہی نے بانی احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ
شائع کیا ہے۔ اس میں نفسیاتی تحقیق کے لیے متنوع مواد موجود ہے
میری رائے میں یہ کتاب بانی احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی
ہے اور مجھے امید ہے کہ کسی دن نفسیات جدیدہ کا کوئی متعلم اس کا
سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے
(اور چند وجوہ سے اس کو ایسا ہی کرنا پڑے گا جن کی تشریح یہاں
نہیں کی جا سکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانی احمدیت اور اس کے ہم عصر
غیر مسلم صوفیا رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے تو اس کو
اس تجربہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہو گی جس کی بنا
پر احمدیت نبوت کی دعوے دار ہے۔"

پنڈت نہرو کا مشورہ

پنڈت نہرو کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں :۔
"پنڈت جواہر لال نہرو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کے
راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں اور اس چیز کی مزاحمت کریں جس
کو وہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طنز آمیز مشورہ

اس بات کو فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے۔ احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بناء پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایان شان نہیں کہ وہ مسلمانانِ ہند پر رجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں مجھے یقین ہے کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانانِ ہند کے اس رویہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آفات و مصائب کے لیے الہامی سند پیش کرتی ہے۔!"

انحطاط الہام کا ماخذ بن جاتا ہے!

ایک بہت ہی فلسفیانہ اور نفسیاتی بحث، تاریخ کے پسِ منظر میں:-

"اسلام کے رخساروں پر اس وقت احمدیت کی جو زردی نظر آ رہی ہے وہ مسلمانانِ ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رونما ہوئے ہیں بانی احمدیت کی ولادت سے پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں

رہ چکے ہیں میرا یہ مطلب نہیں کہ بانی احمدیت اور اس کے رفقاء نے ایک آواز سنی لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اس خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے یا لوگوں کے روحانی افلاس سے پیدا ہوئی اس تحریک کی نوعیت پر منحصر ہونا چاہیئے جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور ان افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے سننے والوں میں پیدا کئے ہیں۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں اقوام کی تاریخ نعیات تبلاتی ہے کہ جب کسی قوم میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے اور اس قوم کے شعراء، فلاسفر، اولیاء، مدبرین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور مبلغین کی ایک جماعت وجود میں آجاتی ہے جس کا مقصد واحد یہ ہوتا ہے کہ منطق کی سحر آفرین قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے ہر اس پہلو کی تعریف و تحسین کرے جو نہایت ذلیل و قبیح ہوتا ہے یہ مبلغین غیر شعوری طور پہ مایوسی کو امید کے درخشاں لباس میں چھپا دیتے ہیں۔ کردار کے روایتی اقتدار کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت کو مٹا دیتے ہیں جو ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی قوتِ ارادی پہ ذرا غور کرو جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے۔ زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے ایران میں اس قسم کا

ایک ڈرامہ بھی لا گیا تھا لیکن اس میں نہ وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے ہندوستان میں اسلام کے لیے پیدا کیے ہیں۔

روس اور انگلستان کا اتحاد مسلمانوں کے خلاف

اقبال نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ اپنے مصالح کے مطابق روس نے بہائیت کی اور انگلستان نے قادیانیت کی سرپرستی اور حمایت کیوں کی:-

"روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی ہمارے لیے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وسعت نظر کی وجہ سے؟ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیئے اسلام کی اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ اسے میں نے سمجھا ہے مجھے یقین کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لیے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک و صاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے ہندوستان کے حالات ایک

نیا رخ اختیار کر چکے ہیں جمہوریت کی نئی روح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے وہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی انہیں یقین ہو جائے گا کہ ان کی دینیاتی ایجادات بالکل بے سود ہیں۔"؛

اسماعیلی اور قادیانی

اپنے مقالات میں جواہر لال نے اقبال پر اور مسلمانوں پر یہ طعن بھی کیا تھا کہ وہ قادیانیوں کو تو اسلام سے خارج اور ملت اسلامیہ سے باہر کر دینے دے رہے ہیں لیکن اسماعیلی فرقہ کو یعنی آغا خانی خوجوں کو کچھ نہیں کہتے جو فکر و عقیدہ کی گمراہیوں میں قادیانیوں سے کہیں زیادہ مبتلا ہیں؟

جواہر لال چونکہ آغا خان کی سیاسی روش سے ہمیشہ نالاں رہے اس لیے انہیں موقع مل گیا کہ اسماعیلیوں کے ذکر کے ساتھ آغا خاں کی "رجعت پسندی" "و کفر" کا جس قدر بہتر طریقہ سے ممکن ہو ڈھنڈورا پیٹیں اور انہوں نے ایسا کیا بھی لیکن جواہر لال نے اسماعیلیوں یعنی آغا خانی خوجوں اور قادیانیوں کی مشابہت اور مماثلت کے بارے میں جو کچھ فرمایا تھا وہ تمام تر غلط اطلاعات ناقص معلومات، اور ناپختہ خیالات پر مبنی تھا وہ اسلام ہی کو پورے طور پر نہیں سمجھتے تو اسماعیلیوں اور قادیانیوں کے فرق کو کیا سمجھ سکیں گے؟ اقبال نے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ جواہر لال نہرو کی اس غلط بینی اور غلط فہمی کو سلجھے ہوئے انداز اور ستھرے پیرایہ میں رفع کرنے کی کوشش کی ہے:۔

"ہز ہائینس آغا خان کے متعلق دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں

میرے لیے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں پر کیوں حملے کیے؟ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں شامل ہیں وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا ہے وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل الفاظ سے مخاطب کیا ہے۔ (ملاحظہ فرمائیے اسٹار الہ آباد ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء)

"گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلعم اس کے رسول ہیں قرآن اللہ کی کتاب ہے کعبہ سب کا قبلہ ہے تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو مسلمانوں کے ساتھ السلام علیکم کہہ کر ملو اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھو پابندی سے روزے رکھو اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو، تمام مسلمانوں سے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو"

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیئے کہ آیا آغا خان اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں یا نہیں؟

اسلام اور عالمِ اسلام

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم!
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

انسانیت کا روگ اور اس کا علاج

اقبال کے افکار و خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا خیال یہ تھا کہ اسلام بہترین ضابطہ حیات ہے، ایک سیاست داں کی حیثیت سے ان کا یہ نظریہ تھا کہ انسانیت کے روگ کا واحد علاج "اسلام" اور صرف اسلام ہے، یہ اقوام و ملل کی کشمکش یہ رنگ و نسل کی آویزش، یہ قبیلہ اور خاندان کی جنگ، یہ ملک و قوم کی عصبیت فوراً ختم ہو سکتی ہے، اگر "اسلام" انسان کی "قومیت" اور "وطنیت" بن جائے۔

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

زندگی بھر وہ اس مسلک کی تبلیغ کرتے رہے، یہی انکی دعوت تھی یہی ان کا پیام۔ دنیا کے مدبروں نے انسان کے درد کا علاج، مختلف طریقوں سے سوچا ہے، کسی کا خیال ہے کہ اشتراکیت دنیا کے تمام مسائل کا واحد اور بہترین حل ہے، کسی کو انسانیت کی فلاح و صلاح آمریت کے نظام میں نظر آئی، کسی کا مسلک یہ ہے کہ مطلق العنان بادشاہت یا محدود ملوکیت ہی انسان کے تمام امراض دیرینہ کا تشفی بخش مداوا ہے، کوئی جمہوریت (ڈیموکریسی) اور عوامیت (ری پبلک) کو انسانیت کی ہر دشواری، پریشانی، اور مصیبت کا تیر بہدف علاج سمجھتا ہے، اقبال نے ان سب تحریکوں پر نظر ڈالی، انہیں جانچا، پرکھا، آزمایا، اور پھر

انھوں نے محسوس کیا، ان نظاموں میں انفرادی طور پر، اگرچہ کچھ خوبیاں بھی ہیں، لیکن ناقابل برداشت قسم کے نقائص بھی ہیں، اشتراکیت، انسانوں کو روٹی اور کپڑا دیتی ہے لیکن ضمیر کی آزادی، اور روح کی بیداری چھین لیتی ہے، آمریت، قوم سے فکر و نظر کی قوت چھین لیتی ہے، عوام نہ خود کچھ سوچ سکتے ہیں، نہ بطور خود کچھ کر سکتے ہیں، ہر معاملہ میں ان کی رائے بے حقیقت اور غیر اہم سمجھی جاتی ہے، بلکہ سرے سے انھیں رائے قائم کرنیکا حق ہی دیا جاتا، بادشاہت اور ملوکیت، خواہ مطلق العنان ہو یا محدود، نااہلوں کو ابھارتی ہے اور مستحقوں کو پیچھے دھکیلتی ہے پھر اس کے "موروثی" مفاسد، کڑوا کریلا پھر نیم چڑھا کے مصداق ہوتے ہیں، جمہوریت اور عوامیت کی دلآویزی میں شبہ نہیں، لیکن یہ وہ نظام ہے جس میں

انسان کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!

ان سب نظاموں کے مقابلہ میں اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے، جس میں اشتراکیت، ملوکیت، عوامیت اور جمہوریت کی تمام خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، اور ان کے نقائص میں سے ایک ایک نقص بھی موجود نہیں، اس نے ایسے حدود مقرر کر دیئے ہیں، جنھیں بروئے کار لانے کے لئے مفاسد کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور محاسن ابھرنے لگتے ہیں، لہذا اقبال انسان کے بنائے ہوئے ناقص اور فاسد نظاموں میں سے کسی کی طرف دعوت نہیں دیتے، فاطر السموٰت والارض کے عطا کئے ہوئے دستور حیات کی طرف دعوت دیتے ہیں، یہی دعوت ان کی زندگی ہے، یہی انکی زندگی کا مقصد،

اسلام سے اس تعلق خاطر کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا، کہ وہ عالم اسلام سے، اس کے مد و جزر سے، اس کے نشیب و فراز سے، اس کے عروج و انحطاط سے پوری دلچسپی لیتے، اسلام کا قیام عالم اسلام پر، اور عالم اسلام کا قیام اسلام پر جب منحصر ٹھہرا تو دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوئے، وہ جس طرح اسلام کے بارے میں پُر امید تھے اور

اُن کا خیال تھا کہ ایک روز دنیا مجبور ہو کر اسلام کے آگے سرِ تسلیم خم کرے گی ، اسی طرح عالمِ اسلام کے بارے میں بھی وہ یاس و نومیدی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے اور برابر بشارتیں دیتے رہتے تھے ،

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ، ذہنِ ہندی ، نطقِ اعرابی!

ساتھ ہی ساتھ وحدتِ ملّی کی تبلیغ بھی جاری رکھتے تھے ،

ایک ہوں مومن حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر!

اقبال کی سیاست اسلام سے وابستہ تھی ، اور اسلام کا عالمِ اسلام سے ناقابلِ انفصال تعلق تھا ، لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہے کہ اقبال اور سیاستِ ملّی پر گفتگو کی جائے ، مگر اسلام اور عالم کو زیرِ بحث نہ لایا جائے ؟ اِس باب میں ہم اقبال کی زندگی کے اسی پہلو پر گفتگو کریں گے ! ،

المقدس یونیورسٹی

۱۹۳۱ء کے آخر میں فلسطین میں ایک " آل ورلڈ مسلم کانگریس " منعقد ہوئی ، گول میز کانفرنس سے واپسی کے موقع پر ، اقبال اس میں شریک ہوئے ، نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اس کی متعدد ذیلی مجالس کے ممبر بنے اور سرگرمی کے ساتھ مصروفِ کار رہے ، اس موقعہ پر ایک تجویز یہ پیش ہوئی ، کہ ازہر کے نمونہ پر بیت المقدس میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے ، اقبال نے اس تجویز کی مخالفت کی ، اپنے ایک

بیان (یکم جنوری ۱۹۳۲ء) میں فرماتے ہیں:۔

"میں چند سب کمیٹیوں کا ممبر بھی تھا، جنھیں چند مخصوص تجاویز پر بحث کرنی تھی، بدقسمتی سے میں تمام جلسوں میں شریک نہ ہو سکا، ایک سب کمیٹی کے جلسہ میں میں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی، کہ بیت المقدس میں قاہرہ کی جامعہ ازہر ایسے قدیم اور پرانے اصولوں پر ایک یونیورسٹی بنائی جائے، اور اس بات پر زور دیا، کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل موجودہ طرز کی ہونی چاہیئے!"

اقبال کے اس اختلاف سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے جمود اور تعطل سے کس درجہ دل برداشتہ تھے، وہ چاہتے تھے مسلمان، مسلمان رہ کر، دنیا کی ترقی میں حصہ لیں، اقبال کا اسلام ترک دنیا کا معلم نہیں تھا، تسخیر دنیا کی دعوت دیتا تھا تھا، وہ جمود پر کس طرح قناعت کر سکتے تھے؟ ان کی اس اختلافی تجویز کو، دایٹر ایجنسی نے نے خوب اچھالا، ہندوستان (بشمول پاکستان) اور عالم اسلام میں، اس کی آڑ لے کر اقبال کے خلاف خوب پروپیگنڈا کیا گیا، لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہے، خواہ مخواہ کی مخالفت سے نہ مرعوب ہوئے، نہ ہراساں!،

یورپ اور اسلام

گول میز کانفرنس سے واپسی پر، اقبال نے یورپ کے مختلف شہروں کا دورہ کیا، اسپین گئے، وہاں اسلامی عظمت کے کھنڈر بھی دیکھے،

دیکھا بھی دکھایا بھی، سنایا بھی، سنا بھی
پر دل کی تسلی نہ خبر میں نہ نظر میں

واپسی کے کچھ عرصہ بعد ۲۶ مر فروری ۱۹۳۳ء کو ایک بیان میں انہوں نے "یورپ اور اسلام" سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا :-

"یورپ کے مختلف ممالک میں پھرنے اور موجودہ زمانہ کی اخلاقی ابتری دیکھنے کے بعد میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، کہ وہاں اسلام کے بحیثیت دین، قبولیت پانے کا بہترین وقت ہے، آج یورپ کے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں افراد اسلام کی تعلیمات اور اس کے کلچر کو سمجھنے کے خواہاں ہیں، نوجوان مسلمان جس قدر جلد اس حقیقت کو سمجھ لیں، اتنا ہی اچھا ہے، یورپ کے مسلمان اب اس حقیقت کو خوب سمجھ گئے ہیں۔ وہ آئندہ اگست میں جنیوا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں دلی تعاون کریں گے میں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ وغیرہ کی سیاحت کی، اور قرطبہ کی تاریخی مسجد اور غرناطہ کے قصر الحمراء کے علاوہ مدینۃ الزہراء کے کھنڈر بھی دیکھے، یہ مشہور عالم قصر عبد الرحمٰن اول نے اپنی چہیتی بیوی زہرا کے لئے پہاڑ پر تعمیر کرایا تھا، آج کل یہاں کھدائی کا کام جاری ہے، بارھویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان موجد نے سب سے پہلے ہوائی جہاز کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہاں پر منجملہ اور لوگوں کے وزیر تعلیم ہسپانیہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ صاحب ہسپانیہ کی موجودہ روایات کے خلاف بہت خلیق اور روشن خیال ہیں۔ ان کے علاوہ ڈوائن کومیڈی اینڈ اسلام (DIVINE COMMEDY AND ISLAM.) کے شہرہ آفاق مصنف پروفیسر آسین (ASIN.) سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا، وزیر تعلیم

کی زیر ہدایات غرناطہ کی یونیورسٹی میں شعبہ عربیہ میں کافی توسیع ہو رہی ہے، اس شعبہ کا صدر پروفیسر آین اسٹائن کا ایک شاگرد ہے، جنوبی اسپین کے رہنے والے لوگ محمودی الاصل ہونے اور اسلامی تہذیب کی عظیم الشان یادگاروں کو اپنے لئے باعث افتخار سمجھتے ہیں، اب پھر ملک میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی ہے، اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ اسے اور بھی فروغ ہو گا۔ لوتھر کی اصلاحی تحریک ابھی تک ختم نہیں ہوئی، بلکہ یورپ کے مختلف ممالک میں اب بھی یہ تحریک بہت خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے، اور بالخصوص ہسپانیہ میں پادریوں کا اثر آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔"

کابل یونیورسٹی

بادشاہ افغانستان ہز مجسٹی نادر شاہ نے ۱۹۳۲ء کی آخری سہ ماہی میں، متحدہ ہندوستان کے تین مانے ہوئے، اور معروف و مشہور ماہرین تعلیمات، سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود، اور اقبال کو کابل میں مدعو کیا، کہ یہ حضرات وہاں کے ارباب بست و کشاد کو کابل یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں اپنے مشوروں سے مستفید کریں، تینوں بزرگوں نے یہ دعوت قبول کر لی، سید سلیمان ندوی، ہندوستان کی مشہور مذہبی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے روح رواں تھے، سر راس مسعود (سر سید کے پوتے) مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے وائس چانسلر تھے، اقبال اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ایک عرصہ تک تدریس و تعلیم کے مشغلہ میں مصروف رہ چکے تھے، اور ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ جامع العلوم اور مجمع البحرین تھے، وہ مکتب فرنگ کے بھی راز داں تھے، اور علوم مشرقی پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر تھی۔

اقبال کا افغانستان میں بڑا پرتپاک استقبال ہوا، وہ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، بادشاہ والاجاہ

سے لیکر حضرت نور المشائخ ملا شور بازار تک نے، اقبال کو سر آنکھوں پر بٹھایا، اور ان کے افکار بلند سے مستفید ہوئے، یہاں بھی اقبال نے وہی کہا جو قدس شریف میں کہا تھا، یعنی علوم قدیمہ سے ضرور استفادہ کیا جائے، لیکن، علوم عصری سے بھی فائدہ اٹھاتے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ جب تک مسلمان کی تعلیم دین و دنیا کی جامع نہیں ہوتی، اس وقت تک، مسلمان، نہ عروج حاصل کر سکتا ہے، نہ فروغ، وہ اسی طرح ادبار و انحطاط کا شکار رہے گا جس طرح اب ہے، چنانچہ افغانستان سے واپس آنے کے بعد ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو ایک بیان میں وہاں کے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا :-

"شاہ افغانستان نے ہمیں[1] اس لئے دعوت دی تھی، کہ ہم وہاں وزیر تعلیم کو کابل یونیورسٹی کے قیام کے سلسلہ میں مشورہ دیں، اعلیٰ حضرت کی دعوت کو قبول کرنا ہم نے اپنا فرض سمجھا، وہاں کا نوجوان طبقہ نئے علوم کی تحصیل اور انہیں اپنے مذہب اور تمدن کے سانچے میں ڈھالنے کا بے حد خواہشمند ہے، افغان بہت خلیق ہوتے ہیں، اور ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں۔ اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ افغانوں میں ایک نئی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اور ہمیں امید واثق ہے کہ ہندوستان کے تعلیمی تجربہ کی روشنی میں ہم انہیں تعلیمی مسائل میں مشورہ دے سکیں گے۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ خالص دنیوی تعلیم سے اچھے نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ اور خصوصاً اسلامی ممالک میں۔ مزید براں کسی طریقۂ تعلیم کو قطعی اور آخری نہیں کہا جا سکتا، ہر ملک کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اور کسی ملک کے تعلیمی مسائل کے متعلق فیصلہ کرنے میں اس ملک کی

---

[1] یعنی ڈاکٹر اقبال، راس مسعود، اور مولانا سید سلیمان ندوی

خصوصی ضروریات کو خاص طور پہ مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔"

سفرِ افغانستان کے تاثرات

زندگی میں اقبال نے پہلی مرتبہ، ایک آزاد اسلامی ملک — افغانستان — کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، اپنی غلامی، اور ہمسایہ ملک کی آزادی سے وہ بہت متاثر ہوئے ۶ر نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک بیان میں انہوں نے اپنے تاثرات سفر افغانستان کا بڑی عقیدت اور محبت کے ساتھ اظہار کیا، اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :-

"افغانستان میں لوگوں کے جان و مال بالکل محفوظ ہیں، یہ ایک ایسی حکومت کے لئے بذات خود ایک بڑی کامیابی ہے، جسے صرف چار سال پیشتر ملک میں عام بغاوت کو فرو کرنا پڑا ہو[1]، دوسری بات جس سے ہم متاثر ہوئے، وہ وہاں کے وزراء کی نیک نیتی، اور خلوص ہے، جس سے وہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، سخت قسم کے قدامت پسند لوگ بھی ان وزراء کے حامی ہیں اور نتیجۃً جیسا کہ ہمارے سامنے ایک معتدبہ افغان عالم نے کہا آج کے افغانستان میں ملاؤں اور نوجوانوں میں کوئی اختلاف نہیں۔

حکومت افغانستان کا ارادہ ہے کہ سارے محکمہ تعلیم کو جدید طریقوں پر از سر نو ترتیب دیا جائے اور ساتھ ساتھ افغانستان اور ہمسایہ ممالک کے درمیان تمام سڑکوں کی مرمت کی جائے، نئی یونیورسٹی بتدریج ترقی کر رہی ہے اور اس کے لئے ایک خوبصورت اور وسیع محل مخصوص کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے شعبہ طب قائم کیا گیا ہے، اور اس میں اعلیٰ تعلیم شروع ہو گئی ہے۔ دوسرا شعبہ جس کا قیام زیر غور ہے وہ سول انجینئرنگ کا ہوگا، نہ ماسٹر کون کا سوال

[1] بچہ سقہ کی بغاوت مراد ہے۔

تو کابل کو پشاور سے ملانے والی ایک نئی سڑک آئندہ دو سال کے عرصہ میں مکمل ہو جائیگی۔ اس سڑک کا نقشہ بڑے غور و فکر سے تیار کیا گیا ہے روسی سرحد تک جانیوالی سڑک مکمل ہو چکی ہے اور یہ سڑک اس لئے بہت اہم ہے کہ وسطی ایشیا کو وسطی یورپ سے قریب کر دیتی ہے۔

اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان نے ہمیں شرف باریابی بخشا، اور کافی طویل گفتگو ہوتی رہی۔ اعلیٰ حضرت کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے، کہ ان کا ملک پھلے پھولے، اور اپنے ہمسایہ ممالک سے صلح و آشتی قائم رکھے!"

چینی ترکستان کی شورش

عالم اسلام کے ہر اضطراب، ہر شورش، ہر انقلاب پر اقبال کی نظر رہتی تھی۔ جہانِ اسلام کا بعید ترین گوشہ بھی اقبال کی عقابی نگاہ سے بچا ہوا نہیں تھا۔ عالم اسلام کے کسی گوشہ میں جب کسی طرح کی شورش برپا دیکھتے تھے تو فکر و نظر کی ساری صلاحیتیں اس کے تجزیہ، تحلیل اور متوقع عواقب و نتائج پر غور کرنے میں صرف کر دیتے تھے۔

چینی ترکستان ایک بعید ترین، اور بڑی حد تک گمنام علاقہ ہے۔ عام طور پر مسلمان سیاست دانوں اور مفکروں نے اس ملک سے نہ کبھی کوئی دلچسپی لی، نہ وہاں کے واقعات و حالات سے کسی طرح کا ربط رکھا، لیکن، اقبال سیاست دان بعد میں تھے، مسلمان پہلے تھے۔ ان کا اسلامی نقطہ نظر کبھی اور کسی حالت میں ان سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۳ء کے وسط میں، جب چینی ترکستان میں بغاوت اور شورش رونما ہوئی تو اقبال خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے صورت حال کا پورے طور پر جائزہ لیا اور ۱۶ جولائی کے ایک بیان میں وہاں کی اندرونی اور بیرونی سیاست اور اس کے خفیہ اور علانیہ محرکات و عوامل پر بڑے عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی:۔

"ترکستان ایک وسیع ملک ہے جو اس وقت تین حصوں میں منقسم ہے ایک حصے پر روس کا قبضہ ہے، دوسرے پر افغانستان کا اور تیسرے پر چین کا۔ ۱۹۱۲ء میں چینی ترکستان میں چینی مجسٹریٹوں کے تقرر اور حکومت کی طرف سے وہاں کی آبادی پر جو تقریباً ساری کی ساری مسلمان ہے، چینی زبان کے تھوپنے کی کوشش کی وجہ سے بڑی بے چینی پھیل گئی تھی۔ لیکن حالات نے اس وقت زیادہ نازک صورت اختیار نہ کی۔

جہاں تک مجھے علم ہے اس ملک میں موجودہ انقلاب ۱۹۳۰ء میں ایک سترہ سالہ نوجوان چونگ ینگ (CHONG YONG) نامی مسلمان نوجوان کی قیادت میں رونما ہوا تھا سائٹرین ہارٹ (CITROENE HART) مہم کے ایک ممبر مسٹر پٹرو (PETRO) اس کم سن جنرل سے ترکستان میں ملے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں وسطی ایشیائی سوسائٹی کے سامنے ایک لیکچر کے دوران میں انہوں نے اپنے خیالات بیان کئے، اسی سال چونگ ینگ نے ہامی شہر کا محاصرہ کیا ہوا تھا، اور محصور چینی فوجوں کے ساتھ صلح کی بات چیت کرنے کے لئے مسٹر پیٹرو کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ جب مسٹر پیٹرو چینی جنرل اور چینی دفاعی قونصل سے ملے تو انہیں یہ خیال تھا کہ شاید ان سے محاصرین کی فوجی طاقت اور ان کی چالوں کے متعلق کچھ پوچھا جائے گا، لیکن ان کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی کہ جب ان سے پہلا اور ایک ہی سوال یہ کیا گیا، کہ واقعی چونگ ینگ کی عمر صرف ۲۰ سال ہے، جب انہیں یہ بتایا گیا کہ چونگ ینگ نے ابھی عمر کی پوری بیس منزلیں بھی طے نہیں کی ہیں، تو چینی جنرل نے دفاعی کونسل کی طرف جو بھیانک دانتوں کی بولنے کی حالت میں تھا، دیکھا اور کہا:

"میری عمر اس وقت ۶۱ سال ہے اور مدت سے میرے بال سفید ہیں، میرا بڑھاپا ابھی اس لونڈے سے عمر میں زیادہ ہے، میری غیرت یہ کیسے گوارا

کر سکتی ہے کہ میں ایسے بچے کے سامنے ہتھیار ڈال دوں "۔

بوڑھا جنرل بات کا دھنی نکلا۔ اس نے بھوک اور دوسری مصیبتوں کا نہایت صبر و تحمل سے مقابلہ کیا، یہاں تک کہ اسے حکومت چین کی طرف سے کمک پہنچ گئی۔ ایک سخت لڑائی کے دوران میں چونگ بری طرح زخمی ہوا اور اسے کان سو (KANSO) میں پناہ لینی پڑی۔ اس وقت تو لڑائی بند ہو گئی لیکن جلد ہی دوبارہ شروع ہو گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ چونگ اس وقت بھی جنگ میں قیادت کر رہا ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے شاندار کارنامے جو بقول مسٹر پیٹر و جو موجودہ زمانے کی اوڈیسی (ODESSY) کا موضوع بن سکتے ہیں، اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ چنگیز، تیمور اور بابر کا وطن اب بھی اعلیٰ درجہ کے بہادر سپہ سالار پیدا کرتا ہے!"

اس بغاوت کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں :-

"میرے خیال میں اس بغاوت کی اصلی وجہ مذہبی تعصب نہیں ہو سکتی اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی تحریک میں لیڈر ہر قسم کے جذبات کو اکساتے ہیں۔ حقیقی اسباب اقتصادی معلوم ہوتے ہیں!"

ایشیا میں اگر نسلی سوال پیدا ہوا تو اس کے نتائج کتنے خطرناک ہوں گے؟ اقبال بتاتے ہیں:-

"دنیا کے لئے آجکل نسل ہی سب کچھ ہے۔ میں اس قسم کے نظریہ کو موجودہ تہذیب پر سب سے بدنما داغ سمجھتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر کہیں ایشیا میں بھی نسلی سوال پیدا ہو گیا تو یہ بہت خطرناک نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے اسلام کی سب سے بڑی کوشش اس مسئلہ کو حل کرنا ہے۔ اور اگر موجودہ دور میں ایشیائی ممالک تباہ حالی سے بچنا چاہتے ہیں تو صرف یہی ایک طریقہ ہو سکتا ہے، کہ اسلامی نظریوں کو

اپنالیں، اور نسلی امتیازات کو مٹاکر انسانیت کے عام مفاد کو پیش نظر رکھیں۔"

تحریک انقلاب کی کامیابی کن نتائج کی حامل ہو سکتی ہے؟ اقبال اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"میرا یہ خیال ہے کہ چینی ترکستان کا انقلاب کُل توران تحریک نہ بن جائے۔ جو وسطی ایشیا کے موجودہ واقعات پر مبنی ہے، کچھ ہی دن کی بات ہے کہ افغانستان کے مشہور ماہ نامہ "کابل" میں ایران کے ڈاکٹر افشار کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے افغانستان کو "ایران کلاں" کا حصہ قرار دیتے ہوئے اتحاد کی دعوت دی ہے تاکہ دونوں مل کر توران کے بڑھتے ہوئے فتنہ کی روک تھام کر سکیں، بہرصورت یہ یقینی بات ہے، کہ اگر یہ تحریک انقلاب کامیاب ہو گئی، تو افغان اور روسی ترکستان اس کے اثر سے نہیں بچ سکیں گے، خصوصاً موخر الذکر جہاں کچھ تو مذہبی ظلم و تعدی اور کچھ روسی حکومت کی پالیسی نے جس کے ماتحت تمام ملک کو روئی کی کاشت کا مرکز بنا دیا گیا ہے، اور اشیائے خوردنی پیدا کرنے کی گنجائش نہیں رہی، پہلے ہی سخت بے چینی پھیلا رکھی ہے، جہاں تک افغانی ترکستان کا تعلق ہے، مجھے یقین ہے کہ ہم اعلیٰحضرت نادر شاہ کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔"

مایوسی کے اندھیرے میں امید کی روشنی اقبال کو نظر آ رہی ہے:۔

"تحریک کی کامیابی سے ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ چینی ترکستان میں جہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً ۹۹ فی صدی ہے ایک خوش آئند اور مستحکم اسلامی ریاست قائم ہو جائے گی اور اس طرح وہاں کے مسلمان ہمیشہ کے لئے چینیوں کے برسوں کے ظلم و استبداد سے نجات حاصل کر سکیں گے، چینی ترکستان ایک بہت زرخیز علاقہ ہے، لیکن چینیوں کے ظلم و استبداد اور بدانتظامی کے سبب اس وقت صرف پانچ فی صدی علاقہ کاشت ہو رہا ہے۔

ہندوستان اور روس کے درمیان ایک اور اسلامی ریاست کے قیام سے بالشوزم مادہ پرستی دہریت اور بے دینی کے خطرات اگر وسط ایشیا سے مجموعی طور پر بالکل نہ نہ مٹے تو کم از کم ہندوستان کی سرحدوں سے اور زیادہ دور ضرور ہو جائیں گے!"

تقسیم فلسطین کی تحریک

انگریزوں نے اپنے عہد استعمار میں قوموں اور ملتوں کو غلام بنایا، بادشاہوں اور شہریاروں کے تخت و تاج چھینے، کشور کشاؤں اور سپہ سالاروں کو داغ ہزیمت دیا، اپنی قوت و طاقت کے بل پر محکوموں اور مفتوحوں کے ساتھ ظلم و ستم کا برتاؤ روا رکھا، لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا، جائدادیں ضبط کرلیں، جاگیریں چھین لیں، مکانات و باغات پر قبضہ کر لیا، جسے چاہا جیل بھیج دیا، جسے چاہا پھانسی پر لٹکا دیا، جس نے آزادی کا نام لیا اُسے قید و بند اور دار و رسن کی صعوبت میں مبتلا کر دیا، انگریزوں کی ساری تاریخ استعمار اس طرح کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔

لیکن فلسطین کا واقعہ ہر اعتبار سے ایک عجیب و غریب المیہ ہے ایسا المیہ جس کی مثال مکر و دروغ اور غدر و فریب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، فلسطین، نہ صرف فلسطین بلکہ سارے ممالک عربیہ حکومت ترکیہ کے ماتحت تھے، اور اطمینان و فراغت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ترکوں اور عربوں کا مذہب ایک تھا ملت ایک تھی، تہذیب ایک تھی، تاریخ ایک تھی، روایات میں یکسانیت تھی، کوئی وجہ نہ تھی کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوتے۔ ترکوں کا برتاؤ عربوں کے ساتھ اتنا عمدہ تھا کہ کسی طرح کی بغاوت اور شورش کا ذرا بھی امکان نہ تھا۔ لیکن پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) میں انگریزوں اور ترکوں میں ٹھن گئی، ترکوں نے جرمنوں کا ساتھ دیا۔ اور انگریز ترکوں کو فنا کر دینے پر تل گئے۔ انھوں نے عرب ممالک کو متحدہ عرب حکومت کا سبز باغ دکھایا اور دفعتاً سارا عرب ترکوں کے خلاف

باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ حجاز، عراق، شام، لبنان، فلسطین ہر جگہ ترکوں کا قتل عام ہونے لگا۔ ترک سپاہیوں کے گلے کاٹے جانے لگے۔ ترک حکام و عمال موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہو گئے۔ عرب ممالک میں ترک ہونا ایک بہت بڑا جرم ہو گیا۔

وجود ذنب لایقاس به ذنب

عرب ممالک نے ترکوں کو بغاوت کر کے اپنی سرزمین سے، انگریزوں کی اعانت حاصل کر کے نکال دیا۔ لیکن، جنگ عظیم جب ختم ہوئی تو معلوم ہوا کہ اب عرب، ترکوں کے بجائے انگریزوں یا فرانسیسیوں کے غلام ہیں۔ عراق، فلسطین، شرق اردن، پر انگریزوں کا جھنڈا لہرانے لگا۔ شام، اور لبنان پر فرانس نے قبضہ کر لیا۔ متحدہ عرب حکومت کا خواب یوں بالآخر خواب پریشاں ثابت ہوا۔

فلسطین کو نام نہاد جمعیت امم (لیگ آف نیشنز) کے حسب ہدایت برطانیہ نے اپنے انتداب میں لے لیا۔ طے پایا کہ یہ فلسطینی غلام جب آزادی کی صلاحیت پیدا کر لیں گے تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔

لیکن عجیب ستم ظریفی یہ ہے کہ جس زمانہ میں، انگریز عربوں کو متحدہ عرب حکومت کا سبز باغ دکھا رہے تھے اسی زمانہ میں خفیہ طور سے یہودیوں سے یہ وعدہ کر رہے تھے کہ فلسطین کو وطن الیہود بنا دیا جائے گا (یہ سرکاری دستاویزیں شائع ہو چکی ہیں)۔ عربوں کو جب یہ پتہ چلا، تو انہوں نے بہت شور و شر مچایا، لیکن انگریز اپنی پالیسی پر قائم رہے اور دنیا جہان سے یہودی اپنا سرمایہ لے کر فلسطین میں آ کر آباد ہونے لگے۔ یہاں تک کہ چند سال میں جو چند ہزار بھی نہ تھے، کئی لاکھ ہو گئے، جن کے پاس فلسطین میں ایک مکان، اور ایک بیگھہ زمین بھی نہ تھی، وہ اپنے سرمایہ کے بل پر شاندار حویلیوں، اور زمینوں کے مالک بن گئے۔

جب یہودیوں کی تعداد معتدبہ ہو گئی، تو حکومت برطانیہ نے ایک رائل کمیشن فلسطین

کے لیے مقرر کیا، جس نے اپنی رپورٹ میں یہ سفارش کی کہ فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا جائے، اس تجویز پر عمل دس برس بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں ہوا، لیکن اس کی داغ بیل ۱۹۳۷ء ہی میں پڑ گئی تھی۔

اقبال کا غم و غصّہ

انگریزوں کی اس تجویز نے سارے عالم اسلام میں ایک تہلکہ مچا دیا، ہر طرف سے مخالفت اور نفرت کے مظاہرے ہونے لگے، ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو لاہور میں صوبائی مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہوا، اقبال اس جلسہ میں اپنی علالت کے باعث شریک نہیں ہو سکے، لیکن اس اہم ترین حادثہ سے اپنے تئیں الگ کس طرح رکھ سکتے تھے، انھوں نے اس موقع پر ایک بیان دیا جس میں اس مسئلہ کے متعدد پہلوؤں پر بڑی قابلیت اور بے باکی سے گفتگو کی۔ اس بیان کے چند ٹکڑے یہ ہیں :-

"مجھے قوی امید ہے کہ اہل برطانیہ کو اب بھی ان وعدوں کے ایفا پر مائل کیا جا سکتا ہے، جو انگلستان کی طرف سے عربوں سے کیے گئے ہیں۔ مجھے خوشی ہے، کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ایک تازہ بحث میں ملکہ معظم کی حکومت کے فیصلہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے مسئلہ تقسیم فلسطین کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ اس فیصلہ سے مسلمانان عالم کو ایک موقع ملتا ہے، کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس امر کا اعلان کریں کہ وہ مسئلہ جس کے حل کے برطانوی سیاست دان متلاشی ہیں محض فلسطین ہی کا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جو تمام دنیائے اسلام پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہو گا۔"

تاریخی پس منظر

آگے چل کر اقبال نے بتایا :۔

"مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے، بنی اسرائیل کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر اگر اس کا مطالعہ کیا جائے، تو فلسطین میں یہود کا مسئلہ تیرہ سو سال ہوئے حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل ختم ہو چکا تھا، جیسا کہ پروفیسر ہوکنگ لکھتے ہیں یہود اپنی مرضی اور ارادے سے اس ملک سے باہر پھیل گئے، اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب ہوا، مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے، کہ صلیبی جنگیں فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنانے کے سلسلے میں تھیں، تو اس کوشش کو صلاح الدین کی فتوحات نے ناکام بنا دیا، لہٰذا میں فلسطین کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتا ہوں۔"

برطانیہ کے سامراجی ارادے

برطانیہ کی سامراجی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اقبال نے کہا :۔

"مشرق قریب کے اسلامی ممالک سے متعلق برطانوی سامراجی ارادے کبھی بھی اس طرح بے نقاب نہیں ہوئے تھے، جیسے رائل کمیشن کی رپورٹ میں ہوئے۔ فلسطین میں یہود کے لئے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپیریلزم مسلمانوں کے مقدس مقامات میں مستقل سیادت کی تشکیل

میں اپنے لئے ایک مقام کا متلاشی ہے۔ پارلیمنٹ کے ایک ممبر کے قول کے مطابق یہ ایک خطرناک تجربہ ہے، اور اس سے برطانیہ کے لئے بحیرہ روم کا حل میسر نہیں آتا۔ برطانوی مشکلات کو حل کرنے کی بجائے یہ تو برطانوی امپریلزم کے لئے آنے والی مشکلات کا پیش خیمہ ہے۔ ارض مقدس (جس میں مسجد عمر بھی شامل ہے) کی فروخت برطانوی سیاست کا کارنامہ نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے تدبر کا ماتم ہے۔ یہودیوں کے لئے زرخیز زمین اور عربوں کے لئے کچھ نقدی اور پتھریلی اور بنجر زمین کی پیش کش کوئی سیاسی دانائی نہیں بلکہ ایک نہایت ہی، گھٹیا سودا ہے جو اس نامور قوم کے لئے باعث ندامت ہے جس نے عربوں سے آزادی اور اتحاد کے قطعی وعدے کئے تھے!"

ترکوں اور عربوں کے اتحاد کی تردید

اقبال کی دوربیں نگاہ، ہمیشہ نہ تک پہنچتی تھی، اور عام سیاسی معاملات و مسائل میں بھی، وہ ایسے نکتے پیدا کرتے تھے، اور ایسی تجویزیں ان کے دماغ میں آتی تھیں، جو اپنی ندرت و جدت اور ساتھ ہی ساتھ، اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے آپ اپنا نمونہ ہوتی تھیں، چنانچہ وہ عربوں کو ایک نئے راستہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں :-

"یہ رپورٹ مسلمانانِ ایشیا کے لئے بڑی عبرتوں کی سرمایہ دار ہے۔ تجزیہ نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا ہے، کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت و استحکام عربوں اور ترکوں کے فوری اتحاد کر رہی سے عمل میں آسکتا ہے ترکوں کو باقی ماندہ دنیائے اسلام سے علیحدہ کر دینے کی پالیسی ابھی تک جاری ہے"

لگا رہے گا ہے یہ صدا بھی بلند ہوتی ہے، کہ ترک تارک اسلام ہو گئے ہیں۔ ترکوں پر اس سے بڑا بہتان نہیں باندھا جا سکتا۔ اس شرارت آمیز پروپیگنڈے کا شکار، وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جو اسلام کی تاریخ سے نابلد ہیں۔"

اہل عرب کو جن کا شعور مذہبی ظہور اسلام کا موجب بنا اور جس نے مختلف اقوام ایشیا کو ایک حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ متحد کر دکھایا، ترکوں سے ان کی مصیبت کے زمانے میں غداری کے نتائج سے غافل نہ رہنا چاہیے۔"

عرب فرماں رواؤں کی خود غرضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:۔

"نیز عربوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اب وہ ان عرب بادشاہوں پر اعتماد نہیں کر سکتے جو مسئلہ فلسطین کے متعلق ایک آزادانہ اور ایماندارانہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہیں عربوں کا فیصلہ پورے غور و خوض کے بعد ایک آزادانہ فیصلہ ہونا چاہیئے"

اور چونکہ اقبال کی یہ نصیحت نہ سنی گئی، لہذا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر فلسطین تقسیم ہو گیا۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔

قوم ــــ نہ کہ فرد

سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم (متحدہ) پنجاب نے ۱۹۳۷ء کے آخر میں "انٹر کالجیئٹ مسلم برادرہڈ" کو ایک پیغام دیتے ہوئے اپیل کی، کہ اقبال کی خدمت میں، نذر عقیدت کے طور پر، ایک کیسہ زر پیش کیا جائے۔ اقبال اگرچہ مالی اعتبار سے پریشان اور ضرورت مند تھے، لیکن انہوں نے نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ، اس طرح کی رقم قبول کرنے سے انکار کر دیا:۔

" عوام کی ضرورت بہ حیثیت مجموعی کسی ایک فرد واحد کی ضروریات سے کہیں

زیادہ اہم ہوتی ہیں، خواہ اس کی تصانیف عامتہ الناس کے لئے روحانی فیضان کا
ذریعہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک شخص اور اس کی ضروریات ختم ہو جاتی ہیں، لیکن
عوام اور ان کی ضروریات ہمیشہ باقی رہتی ہیں!"

اس کے بعد اقبال نے، ایک نہایت اہم تجویز پیش کی کہ رقم انہیں دینے کی بجائے اسلامیات
سے متعلق ایک تحقیقی شعبہ، اسلامیہ کالج (لاہور) میں قائم کرنے پر صرف کی جائے، انہوں نے
سر سکندر سے اپیل کی کہ وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے، یہ شعبہ قائم کرائیں، اور اپنی
طرف سے سو روپے بھی پیش کئے۔

"مقامی اسلامیہ کالج میں اسلامیات سے متعلق طرز جدید پر تحقیقی شعبہ کا قیام
صوبے کی اہم ترین ضرورت ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے صوبوں میں اسلامی تاریخ،
الٰہیات، فقہ، اور تصوف سے لاعلمی کی وجہ سے اتنا نقصان نہیں اٹھایا گیا جتنا
پنجاب میں۔

یہ بہترین وقت ہے کہ اسلامی فلسفہ اور زندگی کا غائر مطالعہ کر کے
لوگوں پر واضح کیا جائے کہ اسلام کا اصل مقصد کیا ہے، اور کس طرح اس
خول نے جو موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر پر چھایا ہوا ہے، اسلامی اصولوں
اور خیالات کو دبا دیا ہے، اس خول کو فوراً دور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نئی پود کا
ضمیر اس آلائش سے پاک ہو کر فطری اور آزادانہ طور پر نشو و نما پا سکے۔

اس قسم کے ادارے سے مسلمان کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، کیونکہ اسلام ایشیائی
قوموں کی زندگی میں بڑا اہم جزو ہے اور رہا ہے، اور بنی نوع انسان کے مذہبی
اور عقلی ارتقا میں اس کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔

مجھے امید ہے کہ وزیراعظم میری تجویز سے اتفاق کریں گے اور اپنے رسوخ کو استعمال میں لاکر اس تجویز کو کامیاب طور پر عملی جامہ پہنائیں گے میں اس فنڈ میں سو روپے کی حقیر رقم پیش کرتا ہوں۔"

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے، سالِ نو کے سلسلہ میں اقبال کا ایک پیام نشر ہوا، یہ وہ زمانہ ہے کہ اقبال بستر علالت پر دراز ہیں، جو بہت جلد بستر مرگ ثابت ہونے والا ہے۔ ان کی آواز کام نہیں کرتی، اپنا پیام خود نہیں پڑھ سکتے، لکھ دیتے ہیں، اور وہ ریڈیو سے نشر کر دیا جاتا ہے۔

آل انڈیا ریڈیو پر تبلیغ اسلام کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ لیکن اقبال نے جو پیام دیا، وہ صرف اسلام کا پیغام تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ان کی چشم جہاں بیں، دیکھ چکی تھی کہ اطالیہ نے بغیر کسی وجہ کے حبش پر حملہ کیا، اور اسے غلام بنا لیا، فلسطین کے سلسلہ میں لارڈ پیل کی زیر صدارت کمیشن مقرر ہوا اور اس نے تقسیم فلسطین کی تجویز پیش کر دی، ساپین میں بادشاہت اور آمریت (الفانسو اور فرانکو) کے مابین کشمکش ہوئی اور بہت جلد اس نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی، اور برادر کشی کا ہولناک دور شروع ہو گیا۔ جاپان صرف اس لئے چین پر حملہ آور ہوا کہ وہ کمزور تھا، اور جاپان کی مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اقدار انسانی کو پامال کرتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ اقبال نے محسوس کیا، یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ انسان خدا کو بھول چکا ہے، وہ انسان کا خدا سے رشتہ استوار کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

"دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے، اور یہ فخر یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں، اور انسان

ـنے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔
لیکن اس تمام ترقی کے باوجود ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت، اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں، ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے، کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے، وہ خوں ریزی، سفاکی، اور زیردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں، اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں اور کروڑوں مظلوم بندگان خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ انھوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، ان کے ادب، اور ان کے احوال پر دست تطاول دراز کیا، پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خوں ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا، تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں، اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔

جو سال گذر چکا ہے اس کو دیکھو اور نوروز کی خوشیوں کے درمیان دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش ہسپانیہ ہو یا چین، ایک قیامت برپا ہے۔ بے دردی سے تمدن انسانی کے عظیم الشان

آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ہی میں یوم حشر آن پہنچا ہے۔ ہر شخص نفسی نفسی پکار پکار رہا ہے۔ اور کسی دوسرے کے لیے محبت اور ہمدردی کی آواز سنائی نہیں دیتی!"

اس صورت کا مداوا اقبال یہ پیش کرتے ہیں :۔

"تمام دنیا کے ارباب فکر دم بخود ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کے جان و مال کے دشمن بن کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں ؟ دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی علمی قوتیں اپنی توجہ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں گی یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی رہے گی. کیا ہم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسائل کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں، اور اپنے ہی ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ، قومی عصبیت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں، وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے، جو رنگ و نسل کی زبان سے بالاتر ہے جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی، اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللّٰہ کے اصول کا قائل نہ ہوگا جب تک جغرافیائی وطن پرستی، اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکے گا. اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے !"

اقبالؒ نہ ملائے مسجد تھا، نہ درویش دلق پوش، لیکن کیا اسلام کی تبلیغ اتنے موثر انداز میں کوئی اور بھی کرسکتا تھا؟ کیا اسکی بیا سلامت دیکھ کر بے ساختہ یہ اقرار نہیں کرنا پڑتا ہے ۔

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن

۱۹۳۷ء میں دین اور قوم کی کشمکش نے بڑی سنگین اور نازک صورت اختیار کرلی۔ ایک طرف کانگریس تھی، جو اپنے تمام وسائل و ذرائع کے ساتھ یک قومی نظریہ سے اختلاف رکھنے والوں کو کچل دینے کے لئے میدان میں اتر چکی تھی۔ دوسری طرف مسلم لیگ تھی جو اپنی بے بضاعتی، کمزوری اور بے مائگی کے باوجود کانگریس سے ٹکر لے رہی تھی، اور قائد اعظم کی قیادت میں مسلمانوں کی ملی انفرادیت کے قیام و بقا کے لئے مصروف عمل تھی۔ کانگریس کی پشت پر نہ صرف پوری ہندو قوم تھی، بلکہ غیر ہندو، لیکن ہندوؤں سے مرعوب و متاثرہ اقوام کی تائید و حمایت بھی اسے حاصل تھی، نیز مسلمانوں کی بھی کئی جماعتیں ملت اسلامیہ کے سواد اعظم سے کٹ کر مختلف حالات و مصالح کے ماتحت کانگریس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ اور مسلمانوں کی وحدت ملی کو پارہ پارہ کر دینے کی سعی میں کانگریس کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ جواہر لال اپنی کتاب Discovery of India میں مسلمانوں کی کانگریس نواز جماعتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"مسلمانوں میں بھی، مسلم لیگ کے علاوہ بہت سی جماعتیں پیدا ہو گئیں۔ ان میں ایک پرانی اور نسبتاً اہم جماعت جمعیت العلما کی تھی، جس میں ہندوستان کے ہر حصہ کے مولوی اور عالم شامل تھے۔ اس جماعت کا عام رجحان ہو دانستی اور

قدامت پسندانہ تھا، اور لازمی طور پر مذہبی بھی، اس کے باوجود سیاسی حیثیت سے یہ جماعت خاصی ترقی یافتہ اور سامراج کی مخالف تھی۔ سیاسی میدان میں وہ اکثر کانگریس کی حامی اور ہم خیال تھی، اور اس کے رکن کانگریس کے بھی رکن تھے، اور اس کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ احرار جماعت ذرا بعد میں قائم ہوئی، اور اس کا زور پنجاب میں سب سے زیادہ تھا، اس جماعت میں اکثر نچلے متوسط طبقے کے مسلمان شامل تھے، اور اس کا اثر خاص خاص علاقوں کے عوام پر خاصا گہرا تھا، مومن (جلاہوں کی جماعت) گو تعداد میں بہت زیادہ تھے، لیکن بہت غریب، پسماندہ، کمزور اور غیر منظم۔ یہ لوگ بھی مسلم لیگ کے مخالف اور کانگریس کے حامی تھے، لیکن کمزور تھے، اس لئے سیاسی عمل اور جدوجہد سے بچتے تھے، بنگال میں کرشک (کسان) سبھا تھی، جمعیت العلماء اور احرار کانگریس کے معمولی کاموں میں بھی اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اور برطانوی حکومت کے خلاف اس کی عملی جدوجہد میں بھی، اور اس لئے انہیں بھی کانگریس کے ساتھ تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ لیکن مسلمانوں کی خاص جماعت مسلم لیگ تھی، جو برطانوی اقتدار کی محض زبانی مخالفت کرتی رہی اور اس سے آگے نہیں بڑھی۔ مسلم لیگ میں تبدیلیاں بھی ہوئیں، اس نے ترقی بھی کی، اور اس میں برابر کثرت سے مسلمان شامل ہوتے رہے ہیں۔ لیکن اس کی قیادت برابر اونچے طبقہ کے جاگیرداری عناصر کے ہاتھ میں رہی ہے؟"

جواہر لال کے اس تجزیہ سے اُس زمانہ کی سیاست اور ماحول کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے؛

اقبالؒ

اور

سیاستِ ملّی

حصّہ سوم

شاعری

ز من ہنگامۂ دہ ایں جہاں را
دگرگوں کُن زمین و آسماں را
ز خاکِ ما دِگر آدم بر انگیز
بکش ایں بندۂ سُود و زیاں را

○

پہلا دَور

وطنیّت

قوم پروری - وطن پرستی

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اقبال کے افکار و خیالات، اور سیرت اور شخصیت، کا صحیح ترین، عکس ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ جس صفائی، روانی، شستگی، اور جوش و خروش کے ساتھ، وہ شاعری میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں، وہ انہی کا حصّہ ہے۔ شعر ان کی زبان پر آکر ایک حقیقت بن جاتا ہے، خشک اور بے جان حقیقت نہیں، زندہ، پائندہ، اور حیات آفریں حقیقت۔ مختلف سیاسی اور وطنی تصوّرات و نظریات، قائم ہوتے رہتے ہیں، ان میں جوش بھی ہوتا ہے، اور زندگی کی حرارت بھی۔ یہ نظریات انقلاب انگیز بھی ہوتے ہیں، اور تہلکہ خیز بھی۔ ان سے قصرو ایوان میں لرزش بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور عوام کے طبقات ہیں، وہ وجود بھی، جو پہاڑوں اور رعونتوں سے ٹکر لیتا ہے۔ ان کی قوت و حشمت کا یہ عالم ہوتا ہے، کہ جو ان کے سامنے آتا ہے، جو ان سے مقابلہ کرنے کی جرأت کرتا ہے جو ان سے ٹکر لیتا ہے، وہ ٹکڑے ٹکڑے اور پاش پاش ہو جاتا ہے۔ اس کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے، اس کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی ہر دل عزیزی اور وقار کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ وہ کہیں کا نہیں رہتا:

ذرا تحریک خلافت و کانگرس کے طوفان بدوش اور ہنگامہ خیز، اور انقلاب آفریں عہد پر ایک نظر ڈالیئے۔ اس سیل رواں میں تنکے کی طرح بڑی بڑی شخصیتیں بہہ گئیں۔ سر سیندر ناتھ بنرجی، بنگال کے سب سے بڑے لیڈر تھے۔ ان کی شعلہ بار تقریروں نے دہشت پسندوں، اور بمبازوں تک کو انکا معتقد بنا دیا تھا۔ وہ بنگال کے شہر یار بے تاج مانے جاتے تھے۔ لیکن اس تحریک نے انکا، سیاسی وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ختم کر دیا۔ بپن چندر پال ہندوستان کے آسمان سیاست پر آفتاب کی طرح چمک رہے تھے لیکن، انہیں خلافت اور کانگرس کی تحریک نے ایسا گہنایا کہ پھر وہ زندگی بھر اس گہن سے نہ نکل سکے۔ مسز اینی بسنٹ، کا کلمہ پڑھا جاتا تھا لوگ ان کا نام سنکر وفور عقیدت سے سر جھکا لیتے تھے۔ انکی ہوم رول لیگ کا سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ انکی حریت مآبی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ پھر ہندو مت اختیار کر لینے کے بعد تو وہ اور زیادہ آنکھوں کا تارا بن گئی تھیں۔ لیکن اس تحریک کے ریلے میں اس طرح ان کے قدم اکھڑے کہ پھر نہ جم سکے۔ سر تیج بہادر سپرو، اور پنڈت مدن موہن مالوی، وغیرہ سیاسیات ہند کے رکن رکین تھے۔ لیکن اس گرداب میں ایسے پھنسے کہ پھر نہ نکل سکے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی فہم و بصیرت، ان کی جرأت و بیباکی، حق گوئی اور صداقت، دیانت فکر و رائے کا ہر شخص دل سے معترف اور مداح تھا، لیکن وہ اپنے آپ کو اس تحریک کا ہم نوا نہ بنا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ، وہی جناح، جو قوم پرستوں اور وطن پروروں کی آنکھ کا تارا تھا، نظر سے گر گیا۔ جس کے شاندار

سیاسی کارناموں کی داد، خود کانگریس نے "جناح میموریل ہال" تعمیر کرکے دی تھی وہی جناح، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی نظر میں قوم کا دشمن اور ملک کا غدار قرار پایا۔ سر محمد شفیع، سر فضل حسین، راجہ محمود آباد، سر وزیر حسن، سر آغا خاں، وغیرہ، مسلمانانِ متحدہ ہند کے مسلمہ سیاسی رہنما تھے، جنکی پذیرائی ایوان وائسرائے اور قصر گورنر، میں ہوتی تھی۔ جنھیں مسلمانوں کا مستند رہنما تسلیم کیا جاتا تھا، جن کے سیاسی خدمات اور کارنامے بھی تھے۔ لیکن، ان میں سے ایک شخص بھی، اس طوفان کی زد میں آکر، اپنے آپ کو سلامت نہ لے جاسکا۔ بلا استثنا ان سب کی پبلک زندگی ختم ہوگئی۔ ان میں سے کسی کی یہ جرأت نہ تھی، کہ مسلمانوں کے اجتماعات میں شرکت کرے۔ مسلمانوں کو مخاطب کرے۔ اور انھیں اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرے؛

لیکن، اقبال ——— ؟ اس دور میں، اس طوفان خیز، اور ہنگامہ آفریں، دور میں، اقبال کا کیا حال تھا؟ وہ کیا کر رہے تھے؟ وہ کس طرف تھے؛ آزادی کے شیدائیوں اور ملت کے مجاہدوں کے ساتھ، یا قوم کے دشمنوں اور ملک کے غداروں کے ساتھ؟ واقعات وحقائق بڑے بے مروت اور غیر جانبدار ہوتے ہیں، وہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتے "سچی" اور "کھری" بات کہتے ہیں۔ حقائق کی زبان سے واقعات کا بیان، یہ ہے، کہ اقبال نہ صرف یہ کہ تحریک خلافت کے ساتھ نہیں تھے۔ بلکہ اس سے اصولی اختلاف رکھتے تھے، اور اس لیے اس سے اسی طرح الگ اور غیر متعلق تھے، جس طرح ایک مخالف ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں، عین اس زمانہ میں، جب لوگ، سرکاری

ملازمتوں پر لات مار رہے تھے، سرکاری، اسکولوں، کالجوں، اور یونیورسٹیوں کا بائیکاٹ کر رہے تھے، سرکاری عدالتوں کا مقاطعہ کر رہے تھے، سرکاری خطابات واپس کر رہے تھے، اقبال کو "سر" کا خطاب دیا گیا، اور انہوں نے اسے قبول بھی کر لیا، جس پر کسی دل جلے نے یوں فقرہ چست کیا کہ

سرکار کی دہلیز پہ "سر" ہو گئے اقبال !

لیکن تحریک آزادی خلافت میں شریک نہ ہونے، اس سے اظہار اختلاف کرنے، اور حکومت کا دیا ہوا خطاب قبول کر لینے کی سزا اقبال کو کیا ملی ؟ کیا ان کا مقاطعہ کیا گیا ؟ کیا انہیں ذلیل و رسوا کیا گیا ؟ کیا ان کے خلاف جلوس نکالے گئے ؟

کوئی شبہ نہیں، اقبال کے اس طرز عمل نے کسی حد تک انکی عوامی ہر دل عزیزی کو نقصان پہنچایا، لیکن "تعلیم یافتہ" اور اونچے سیاسی طبقہ میں ان کا وقار اب بھی قائم تھا۔ واقعات کی یہ کیسی ستم ظریفی ہے، کہ تحریک خلافت و کانگرس کے روح رواں، رکن رکین اور سالار کارواں محمد علی اور شوکت علی، گو اسیر فرنگ، اور گرفتار بلا تھے، لیکن جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں، ان کا بہترین مشغلہ، کلام اقبال کا مطالعہ تھا۔ اقبال کے شعر پڑھتے تھے۔ سر دھنتے تھے، روتے تھے، رلاتے تھے، مرمٹنے اور جان دے دینے پر (اقبال کے مقابلہ میں نہیں، حکومت برطانیہ کے مقابلہ میں) اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ تیار ہو جاتے تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے ہر مخالف رہنما کا سیاسی وجود ختم کر دیا۔ لیکن اقبال کے حضور میں، ان کا سر نیاز برابر خم ہوتا رہا۔ یہ اقبال پر بگڑتے تھے، جھنجھلاتے تھے، خفا ہوتے تھے، کبھی نکتہ چینی بھی کرتے تھے۔ لیکن

اسے مانتے تھے، کہ اقبال ہی ہمارا معلم ہے، اقبال نہ ہوتا تو ملت کے لیے مر مٹنے کا جذبہ ہم میں کبھی نہ پیدا ہوتا۔ وہ اقبال کے اشعار ہیں جنھوں نے ہم میں ایک نیا جذبہ، ایک نیا ولولہ، اور ایک نیا حوصلہ پیدا کیا۔ —— یہ اقبال سے چاہے جلنے جتنا ہوں، لیکن اقبال کی پیدا کی ہوئی روح پر نازاں اور مفتخر تھے۔ وہ اقبال ہی تو تھا جس نے ہندوستان اور مسلمانان ہند کو ایک نیا تصور عطا کیا تھا، ایک نئے راستہ کی طرف دعوت دی تھی، ایک نئی بات سنائی تھی۔

اقبال کی سیاسی شاعری کو بڑی آسانی سے دو دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا دور ہے، وطن پرستی اور قوم پروری کا، دوسرا دور ہے، ملیت اور بین الاسلامیت کا، ان میں سے کوئی دور بھی ایسا نہیں ہے، جو اقبال کے شایان شان نہ ہو۔ وطن پرستی اور قوم پروری کے دور میں بھی، انکی بلندی تک پہونچنا کسی کے لیے آسان نہ تھا۔ ملیت اور بین الاسلامیت کے دور میں تو، انکی پرواز دیکھ کر دشمن بھی حیران رہ گئے۔

اقبال کی شاعری کے ان ہر دو ادوار پر ہم الگ الگ گفتگو کریں گے، سب سے پہلے، اس مختصر دور کو لیتے ہیں، جو وطن پرستی اور قوم پروری کا دور تھا۔ یہ شعلۂ مستعجل کی طرح اپنی چمک دکھا کر بہت جلد ختم ہو گیا، لیکن اس دور کی خصوصیتیں نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔

(۱) وطن پرستی کا زمانہ اقبال کی شاعری کا ابتدائی زمانہ تھا، لیکن خیالات کی گہرائی افکار کی بلندی، اور جذبات کی آمد، اس دور میں بھی، اپنی مثال آپ ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ، غالب کا خیال

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اگر غالب کیلئے ایک حقیقت تھا تو اقبال کے لیے اس سے کہیں زیادہ تابندہ، اور درخشاں حقیقت تھا۔ شعر کو، اقبال نے اپنے افکار و تاثرات کے اظہار کا ذریعہ بنا کر، جہاں شعر و شاعری پر بہت بڑا احسان کیا، وہاں انہوں نے ملّت اسلامیہ اور ہندوستانی قوم کو بھی، وہ گراں بہا تحفہ دیا، جسے وہ ہمیشہ ممنونیت کے ساتھ یاد رکھے گی۔۔

اب ہم اقبال کی وطنی اور قومی شاعری کا ایک سرسری جائزہ لیں گے۔

(۱)

اَے ہمالہ!

اقبال کے پہلے مجموعۂ اشعار — بانگ درا — کی سب سے پہلی نظم ہمالہ ہے۔ یہ نظم جدت تشبیہہ، حسن استعارہ، جوش کلام، اور اسلوب بیان، اور طرز زبان کے اعتبار سے، بے مثل ہے۔ یہ نظم خالص وطنی، اور قومی، جذبات سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے۔ یہ رنگ ایک ایک شعر، ایک، ایک مصرع، اور ایک ایک لفظ سے جھلک رہا ہے۔ چند اشعار ضرور سنیئے:۔

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں!
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں!

ہمالہ کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے بعد، وہ اسکی "دیرینہ روزی" پر غور کرتے ہیں، تو اس میں بھی انہیں رعنائی اور برنائی نظر آتی ہے:

تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
نوجواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ہمالیہ کی عظمت اور دیرینہ روزی کا ترانہ گا چکنے کے بعد، اقبال اسکی سیاسی اہمیت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے، اور بڑے ہمہمہ اور طمطراق کے ساتھ کہتے ہیں:۔

امتحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوار ہندوستاں ہے تو

ذیل کے دو شعروں میں ندرتِ تخیل کا جلوہ دیکھیے :-

مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

(۲)

صدائے درد

اقوام ہند کی باہمی چپقلش، فسادات، کشت و خون، بدگمانی، بے اعتمادی، انتشار پراگندگی، یہ مناظر دیکھ کر اقبال کو صدمہ ہوتا تھا، وہ چاہتے تھے "اس دیس کے رہنے والے، سکون و عافیت، اعتماد و محبّت، اشتراک و تعاون، شرافت اور اخوت" کی زندگی بسر کریں، "تاکہ قوم ترقی کرے، اور سربلند ہو"، لیکن اس کے بجائے ہوتا یہ تھا، کہ "اقوام ہند کے افتراق سے ایک غیر قوم" ـــــ انگریز ـــــ فائدہ اٹھارہی تھی، وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عامل تھی۔ وہ، اپنی بقا اسی میں سمجھتی تھی کہ ہندوستان میں بسنے والی قومیں، جنگ زرگری میں مبتلا رہیں۔ ان حالات سے افسردہ اور دل برداشتہ ہوکر، کبھی کبھی اقبال یہ سوچنے لگتے تھے کہ "نغمہ پیرائی" کا شغل ہی ترک کر دیں اور، کوئی کنجِ عافیت سنبھال کر خاموشی کی زندگی بسر کرنے لگیں۔

صدائے درد اقبال کی ایک طویل نظم ہے، لیکن اس کی روح ان چار شعروں

میں سمٹ آئی ہے :-

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

(۳)

امتیازِ دیر و حرم

اپنی قومی شاعری کے دور میں، اقبالؔ امتیازِ دیر و حرم کے قائل نہیں تھے، وہ یک رنگی، یک نوائی، اور یک قومی فلسفہ کے علمبردار تھے، وہ شمع سے لو اٹھتے دیکھتے ہیں، تو خیال کرتے ہیں یہ دھواں نہیں کسی دل جلے کی آہ ہے، وہ کہتے ہیں، شمع کی روشنی مندر اور مسجد میں امتیاز نہیں کرتی، پھر میں کیوں امتیازِ دیر و حرم کے بندھن میں اسیر رہوں؟

کعبے میں بتکدے میں ہے یکساں تیری ضیا
میں امتیازِ دیر و حرم میں پھنسا ہوا

ہے شانِ آہ کی تیرے دودِ سیاہ میں
پوشیدہ کوئی دل ہے تیری جلوہ گاہ میں

(۴)

وطن کی نوحہ خوانی

بانگ درا میں اقبال کی ایک طویل، اور پرخروش نظم "تصویر درد" نظر آتی ہے، اس نظم میں، اقبال نے، وطن عزیز کے حال زار کا نقشہ کھینچا ہے، اس کے مرض کی تشخیص کی ہے، اور اس کا مداوا بھی تجویز کیا ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے بڑے اثرانگیز، اور لرزہ خیز، انداز میں جمود و تعطل کے باعث آنے والے دور کی ایک بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اور اہل وطن کو متنبہ کیا ہے، کہ ہوشیار ہوں، اور کمر ہمت کس لیں، ـــــ چند شعر:۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

اہل وطن پر کتنے گہرے طنز کے ساتھ گلچیں کو مخاطب کرتے ہیں:۔

نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تیری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

پھر آنے والے وقت سے ڈرتے ہیں:۔

چھپا کر آستین میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں!

اقبال ماضی کی داستانوں میں کوئی کشش نہیں دیکھتے۔ صرف حال کی طرف توجہ کی دعوت دیتے ہیں:۔

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں

پھر دعوت فریاد دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

یہ خاموشی کہاں تک؟ لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو، اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

(۶)

زخمِ پنہاں

ہندوستان کی فرقہ وارانہ مناقشت، اور باہمی فساد و فتنہ سے اقبال اتنے عاجز آ چکے ہیں، کہ ان کی آنکھیں خون کے آنسو رونی ہیں، ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان کو سربلند اور رفیع المرتبت دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن

جب تک باہمی انتشار نہ دور ہو، یہ کیونکر ممکن ہے؟ وہ اپنے عزم صمیم کا جائزہ لیتے ہیں، اور کس جوش سے کہتے ہیں :-

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

کتنے ولولہ، اور ادعا کے ساتھ گل افشانی کرتے ہیں :-

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا
مجھے اے ہمنشیں! رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

(۷)

تعصّب

ہندوستان کی مختلف اقوام اور خاص کر ہندو مسلم تعصّب سے متاثر ہو کر، کتنے پر شکوہ اور پر اثر انداز میں اقبال گویا ہوتے ہیں :-

دکھا دے حسنِ عالم سوز اپنی چشم پر نم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو، رلاتا ہے شبنم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو
نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنا ہے، کہ لے اڑتی ہے شبنم کو
پھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنی مرہم کو

(۸)

چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

اقوامِ ہند کے باہمی اختلافات، فرقہ آرائی اور تعصب نے، اجنبی حکمرانوں کو نئی طاقت بخش دی ہے، اور اس دیس کے رہنے والے اپنے ہی وطن میں بے آبروئی اور بے عزتی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، شاعر کس حسرت سے کہتا ہے :-

— تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے، پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

دنیا میں رہنے کا گر، اور باعزت زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں :-

نہ رہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے، دنیا میں او بیگانہ خو رہنا
شراب روح پرور ہے، محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام و سبو رہنا

(۹)

ترانۂ ہندی

عہد غلامی میں ایک عرصہ دراز تک، ہندوستان "قومی ترانہ" سے محروم رہا، برطانیہ کا نیشنل انتھم ہی ہندوستان کا قومی ترانہ تھا، ہوم رول لیگ، کانگریس، مسلم لیگ، آزاد سبھا، انڈی پنڈنٹ پارٹی، لبرل لیگ، کسی جماعت نے بھی اس کی طرف توجہ نہ کی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ تکلیف وہ منظر ہوتا تھا، جب غیر ممالک فرانس، جرمنی، امریکہ، وغیرہ میں، ہندوستانی طلبہ سے یہ چھبتا ہوا سوال کیا جاتا تھا کہ "تمہارا قومی ترانہ کیا ہے:" سناؤ "، عام طور پر ایسے موقعوں پر ہندوستانی طلبہ شرم سے گردن جھکا لیتے تھے۔

اقبال نے سب سے پہلے یہ ضرورت محسوس کی اور ایک نہایت اچھوتا، دل آویز اور روح پرور، "ترانہ ہندوستان" اور ہندوستانی قوم کو عطا کیا، یہ ترانہ اس قابل تھا کہ کانگریس اسے اپناتی، لیکن اس کے "غیر متعصب" اور فراخ دل "رہنما اپنے اندر کبھی اتنی عالی ظرفی نہ پیدا کر سکے کہ" ہندے ماترم "کے سراسر متعصبانہ ترانہ کے مقابلہ میں اسے ترجیح دیتے۔

اقبال کا ترانۂ ہندی لفظی اور معنوی ہر اعتبار سے وجد آفریں اور روح پرور ہے۔ فرماتے ہیں

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں، اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جس کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر، روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

(۱۰)

وطن کا سپاہی

وطن کے عشق میں اقبال کس درجہ سرشار تھے اور اپنے جذبہ وطن کو، کس طرح نمایاں کیا کرتے تھے، اسکے ثبوت ہیں، انکی ایک نظم "صبح کا ستارہ" کے چند اشعار پڑھیے

یہ صبح کا ستارہ، اپنی رفعت اور بلندی میں اور زیادہ اضافہ کرنا چاہتا ہے لیکن کس طرح، اور زیادہ اونچا ہو کر نہیں، اس خاکِ دانِ وطن کے ایک محبِ وطن سپاہی کے گھر میں پہونچکر، اپنی حسرت کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

اشک بن کر سرِ مژگاں سے اٹک جاؤں میں
کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں؟
جس کا شوہر ہو رواں، ہو کے زرہ میں مستور
سوئے میدانِ وغا، حبِّ وطن سے مجبور
زردرخصت کی گھڑی عارض گلگوں ہو جائے
کششِ حسن، غمِ ہجر سے افزوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں
ساغرِ دیدۂ پرنم سے چھلک ہی جاؤں
خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں!
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

(۱۱)

قومی گیت

ترانۂ ہندی کے علاوہ اقبال نے 'ہندوستانی بچوں کے لیے' ایک قومی گیت بھی موزوں کیا تھا، یہ بھی 'اپنی معنویت' اور جذب و اثر کے لحاظ سے اس قابل تھا، کہ ہندوستان کے ہر اسکول، اور کالج میں، طلبہ، اپنے اجتماعات میں اسے گاتے 'لیکن' ہندوستان اس نعمت سے بھی محروم رہا، گیت کے چند بول:۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا

جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا
سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا
ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

(۱۲)
نیا شوالہ

اقبال کی وطن پرستی نے انہیں فکر و نظر کے جس راستہ پہ لا کھڑا کیا تھا، وہ یہ تھا کہ ہندوستان کی رہنے والی قومیں ایک ہو جائیں، دوئی مٹ جائے، اور وحدت قومی، تمام اختلافات کو ختم کر دے، نہ کوئی ہندو رہے نہ مسلمان، نہ عیسائی، نہ یہودی، نہ بدھ، نہ پارسی سب ہندوستانی ہو جائیں، اور اسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر، اپنی زندگی کا نیا سانچہ ڈھالیں، اور ایک نیا نظامِ زندگی عمل میں لائیں۔ یہ دعوت عام تھی، ہر اس شخص کیلئے جو اس دیس میں پیدا ہوا ہے۔

اس زمانہ میں اقبال نے اپنی مشہور اور ناقابل فراموش نظم "نیا شوالہ" لکھی تھی، ان سطروں کے لکھنے والے نے اپنی آنکھوں سے مسز سروجنی نائیڈو کو اس نظم کے اشعار جھوم جھوم کر پڑھتے اور لطف لیتے دیکھا ہے۔ اقبال کی اس نظم کو اردو داں ہندوؤں نے اور مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ اور مذہب بیزار طبقہ نے بہت زیادہ پسند کیا، اقبال کی شہرت جن چند نظموں پر قائم ہوئی، ان میں ایک نیا شوالہ بھی ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

اپنے نئے شوالہ کے گن گانے سے پہلے اقبال پرانے شوالہ کے پجاری پر طنز کرتے ہیں۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ

دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے،
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(۱۳)

وطن

اقبال غزلیں بہت کم کہتے تھے، لیکن جب کہتے تھے، تو خوب کہتے تھے، غزلوں میں بھی، وہ اپنے پیام اور مقصد کو فراموش نہیں کرتے تھے، تغزل کے پہلو بہ پہلو، قوم اور وطن کی داستاں سرائی بھی کرتے جاتے تھے، مثلاً دو شعر:-

اس چمن میں مرغِ دل گائے نہ آزادی کا گیت
آہ! یہ گلشن نہیں، ایسے ترانے کے لیے،
ہے عاشقی میں رسم الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی، حرم بھی، کلیسا بھی چھوڑ دے

(۱۴)

جذبِ باہم

طرح طرح سے، نئے نئے اسلوب، اور انداز سے اقبال ہندوستان میں رہنے اور بسنے والی قوموں کو، اتحاد باہمی کی تلقین کرتے رہتے تھے، ایسی ایسی تمثیلیں پیش کرتے ہیں، جو دل پر اثر کرتی ہیں، دل میں اتر جاتی ہیں، آسمان پر ستاروں کی محفل جمی ہوئی

ہے، اقبال کی نظر بزم انجم پر پڑتی ہے۔ اور ان کی نگاہ دوربیں دیکھ لیتی ہے کہ سارا نظام "جذب باہم" پر قائم ہے، اگر یہ جذب باہم مٹ جائے، تو یہ نظام بھی ختم ہو جائے اسی مثال کو واضح کرتے ہوئے، اپنے ہم ملکوں، اور ہم قوموں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:۔

حسن ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں
جس طرح عکس گل ہو شبنم کی آرسی میں
آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا!
منزل یہی کٹھن ہے، قوموں کی زندگی میں
یہ کاروانِ ہستی ہے تیز گام ایسا
قومیں کچل گئی ہیں جس کی رواروی میں
آنکھوں سے ہیں ہماری غائب ہزاروں انجم
داخل ہیں وہ بھی لیکن اپنی برادری میں
اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے
جو بات پاگئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

دُوسرا دَور

مِلّیّت اَور بَینُ الاِسلامیّت

بُتانِ رنگ و خُوں کو توڑ کر مِلّت میں گُم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی، نہ تُورانی، نہ افغانی!

○

ایک ہوں مُسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

○

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خُوں مٹ جائے گا،
تُرکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والاگُہر

○

واحد چارۂ کار

عمر کے ساتھ ساتھ انسان کے افکار و خیالات میں بھی پختگی آتی ہے، مشاہدات و تجربات اسے اور زیادہ استحکام بخشتے ہیں، بصارت کے ساتھ بصیرت بھی بڑھتی ہے، اور یہی بصیرت پھر انسان کو ایک ایسے مقام رفیع پر پہنچا دیتی ہے، کہ دوسروں کے لئے وہاں پہنچنا تو بڑی چیز ہے، وہاں تک نگاہ کرنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا آغاز، وطن پرستی اور قوم پروری سے ہوا، لیکن چند ہی سال میں یہ دور ختم ہو گیا۔ اس مدت میں، انہوں نے اندازہ کر لیا کہ انسانیت کے دکھ کا علاج نہ وطنیت ہے، نہ قومیت ہے۔ ان دونوں پر تنگ نظری اور تعصب کی حکومت ہے۔ وطن کے لئے آدمی حق کو چھوڑ سکتا ہے، قوم کے لئے دوسروں کے گلے کاٹ سکتا ہے۔ جو نظریۂ حیات اتنا سفاک ہو وہ انسانیت کی فلاح و صلاح کا ضامن کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے؟ مرض کو علاج قرار دینا دانش مندوں کا شیوہ نہیں۔

لیکن اقبال نے دیکھا ساری دنیا وطنیت اور قومیت کے راستہ پر گامزن ہے۔ انگلستان کا ایک باشندہ اپنے ملک اور قوم کے لئے سب کچھ کر گزرتا ہے۔ جائز اور ناجائز کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایک جرمن وطن پرست اپنے ملک اور قوم کے لئے، دوسری قوموں کو

کچلنے اور غیر ملکوں کو برباد کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتا۔ ایک فرانسیسی اس پر ناز کرتا ہے کہ اس نے ''دنیا کو جمہوریت کی نعمت سے نوازا''، لیکن اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ''بے تامل'' اور ''بے جھجک'' وہ دوسری قوموں اور ملتوں کو تہ تیغ، اور توپ دم کر دیتا ہے۔ ہندوستان نے انگلستان کا کیا بگاڑا تھا؟ لیکن انگریز، صرف اس لئے اس پر قابض ہیں کہ ان کے وطن اور قوم کا مفاد اسی میں ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں، قیصر ولیم کی فوجوں کا سیلِ سبک سیر و زمیں گیر، کئی ہمسایہ مملکتوں اور ملکوں کو اجاڑتا، فنا کرتا اور برباد کرتا چلا گیا۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ عظیم جرمن قوم کا وطنی اور قومی مفاد اسی اقدام میں مضمر تھا۔ فرانس کے ساتھ شام، لبنان، مراقش، الجزائر اور تیونس کے مسلمانوں نے کون سی بدسلوکی اور زیادتی کی تھی، جس کے انتقام میں اس نے ان قوموں کو اپنا غلام بنالیا؟ کوئی نہیں! ان کی خطا یہ تھی کہ کمزور تھے اور غلام بننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مصر، سوڈان، عراق، شرق اردن، فلسطین غیر ملکی استعمار کا شکار کیوں بنے؟ کیا صرف اس لئے نہیں کہ اجنبی استعماری ممالک ان سے فائدہ اٹھا سکتے تھے، ان کے وسائل و ذرائع پر قبضہ کرکے اپنے ملک اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکتے تھے؟ ایران پر فوج کشی کیوں ہوئی؟ عرب کی آزاد حکومتوں کے جگر کے ٹکڑے، عدن، بحرین، مسقط، کویت، الج وغیرہ برطانوی حفاظت (Protection) کے ''دام ہمرنگ زمیں'' کے صید کیوں بنے؟ صرف اس لئے کہ عرب ان کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ انگریزوں نے ان کی ''حفاظت'' کی اور تیل کے سمندر پر قبضہ کر لیا۔

شروع شروع میں تو اقبال وطن اور قومیت کے گیت گاتے رہے۔ لیکن جب انہوں نے وطنیت اور قومیت کے یہ جگر فگار اور لرزہ خیز کرشمے دیکھے، تو ان کا دل دہل

اٹھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئے، کہ وطنیت اور قومیت، تو انسانیت کے لئے، ایک لعنت ہے۔ یہ مداوا نہیں مرض ہے۔ یہ جوع الارض ہے، یہ ہوس استعمار ہے یہ دھاندلی ہے۔ یہ ظلم ہے۔ یہ شقاوت ہے۔ یہ درندگی ہے۔ یہ بربریت اور وحشت ہے۔ انسان کے رہنے اور بسنے کے لیے، خدا نے یہ زمین پیدا کی ہے۔ اس لئے نہیں پیدا کی ہے کہ اس کے حصّے بخرے اور ٹکڑے کر کے انسان انہیں پوجنے لگے۔ قوموں کے وجود کا مقصد تعارف باہمی قرار دیا تھا، خوں ریزی اور قتل عام نہیں۔

یقیناً یہ حقیقت بھی اقبال کے سامنے آئی ہو گی، کہ ایک آدمی انگلستان میں پیدا ہوا، انگریز کہلایا، ایک ہندوستان میں پیدا ہوا، ہندوستانی مشہور رہوا، لیکن انگلستان، یا ہندوستان وغیرہ میں پیدا ہونا کوئی اختیاری چیز تو نہیں۔ یہ تو ایک اتفاقی حادثہ ہے، کہ کون کس ملک، اور کس قوم میں پیدا ہوتا ہے، اس اتفاقی حادثہ کو عظمت، بزرگی، افتدار اور سربلندی کا معیار اور سرچشمہ بنا لینا کہاں کی دانائی ہے؟

دنیا کے ہر ملک اور قوم کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد، اقبال کی نظر اسلام پر پڑی، اور بالآخر، اسلام کی صورت میں انہوں نے اپنا گوہر مقصود پالیا۔ اسلام نہ وطن کا قائل ہے، نہ قوم کا، نہ رنگ کا، نہ نسل کا، نہ قبیلہ کا نہ خاندان کا۔ وہ عالمگیر انسانی اخوت کا قائل ہے۔ وہ ساری دنیا کو ایک کنبہ سمجھتا ہے۔ ہر وہ شخص، جو توحید و رسالت کا اقرار کر لیتا ہے، ایک ایسی ملت کا فرد بن جاتا ہے، جس میں قوم و وطن اور رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسلام کی مسجد، پارلیمنٹ بھی ہے، مجلس درس بھی، مسند وعظ و تذکیر بھی، اور ایوان سیاست بھی، اس میں ہر مسلمان شریک ہو سکتا ہے، خواہ وہ کالا ہو یا گورا، امریکہ کا رہنے والا ہو یا قطب شمالی کا۔ جس دن اسلام کی یہ حقیقت، اقبال کے ذہن میں آئی، اسی دن سے وہ

شاعرِ اسلام بن گئے۔ انہوں نے ایک طرف مسلمانوں کو للکارا کہ وہ اپنے لعلِ شب چراغ کو چھوڑ کر دوسروں کے خزف ریزوں پر للچائی ہوئی نظریں کیوں ڈالتے ہیں؟ دوسری طرف انہوں نے دنیا میں منادی کی، کہ تمہارے مسائلِ عام اس سے کہ وہ معاشی ہوں، یا سیاسی صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اب تک تم نے گمراہی کی زندگی بسر کی ہے، اب جادۂ صواب نظر کے سامنے ہے، آؤ، اور اس پر گامزن ہو جاؤ۔

جیسے جیسے اقبال اس حقیقت کو سمجھتے گئے، ان کی آواز میں زیادہ زور، ان کے لہجہ میں زیادہ جوش، اور ان کے پیام میں، زیادہ وزن پیدا ہوتا گیا۔ شروع میں یہ آواز سنی کی ان سنی کر دی گئی، اس لئے کہ یہ کچھ عجیب سی تھی۔ عرصۂ دراز اور مدت مدید کے رچے اور رمے ہوئے تخیلات و تصورات پر اس سے زد پڑتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ آواز مانوس ہوتی گئی۔ اسے مسلمانوں نے بھی سنا، اور غیر مسلموں نے بھی۔ کچھ نے مذاق اڑایا، بہتوں نے سوچا اور غور کیا، اور یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ اقبال کا پیام ——
—— (ملیت اور بین الاسلامیت) ہی دکھی انسانیت کا واحد چارۂ کار ہے۔

تلملاہٹ اور برہمی

وطنی رہنماؤں کی ایک بڑی جماعت اقبال کی وطن پرستانہ اور قوم پرورانہ شاعری کی مداح و معترف تھی، لیکن جب اقبال نے اپنی دعوت کا رخ بدلا، اور ملیت و بین الاسلامیت کو اپنا پیام بنایا تو ان کے سابق مداح اور ثنا خواں تلملا اٹھے، بگڑ گئے، خفا ہو گئے، اس لئے کہ اقبال کی یہ تحریک ان سیاست دانوں کے قصرِ قیادت کے لئے زلزلہ فگن تھی۔ اور وہ کسی قیمت پر بھی اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے، کہ ان کی چودھراہٹ پر

ضرب لگے، اور وہ قوم و ملک کو، قومیت اور وطنیت کی جس ڈگر پر لے جا رہے تھے، اس میں کوئی فرق آئے۔

متحدہ ہندوستان کے غیر مسلم سیاست دانوں میں، جواہر لال، سیاسی حیثیت کے علاوہ بلند پایہ علمی منزلت کے حامل بھی ہیں۔ وہ مورخ بھی ہیں، اور فلسفۂ تاریخ کے رمز آشنا بھی۔ اقبال کے اس نئے رنگ پر وہی سب سے زیادہ تلملائے، اس لئے کہ غیر مسلم ہندوستانی سیاست دانوں میں وہی ایک ایسے شخص تھے، جنہوں نے پیام اقبال کے خوفناک مضمرات کو بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ اپنی کتاب "تلاش ہند" (India Discovery of) میں اقبال کی شاعری کے ہر دو ادوار پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے اپنے قلب مضطرب کو تسلی دینے کی ناکام کوشش یوں کی ہے:-

"جاگیر دار طبقہ کی قیادت عوام کی تحریک خلافت کے سیلاب میں بہ گئی تھی، لیکن خود یہ تحریک سماجی اور معاشی حالات کی ٹھوس بنیادوں یعنی عوام کی ضرورتوں پر قائم نہ تھی، اس کا مرکز ملک کے باہر تھا، اور جب اتاترک نے اس مرکز ہی کو ختم کر دیا، تو تحریک خلافت کی ساری عمارت ایک دم سے بیٹھ گئی۔ مسلم عوام کے حواس جاتے رہے، اور ان میں کسی قسم کے سیاسی عمل کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ پرانے جاگیر دار قسم کے لیڈر، تو ایسے موقعہ کے انتظار ہی میں تھے۔ وہ برطانوی پالیسی کی مدد سے جس نے ہمیشہ ان کی دست گیری کی تھی، پھر میدان میں آ گئے۔ لیکن اب وہ پہلی سی بات نہ تھی، کہ لوگ ان کی قیادت کو بے چون و چرا قبول کریں۔ اب حالات کا رنگ کچھ اور ہو گیا تھا۔ مسلمانوں میں بھی بہت دیر کے بعد ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔ عوام کی

سیاسی تحریک نے جو نیشنل کانگریس کی قیادت میں اٹھی تھی، ان پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔

اگرچہ دراصل مسلمان عوام اور نئے طبقے کی ذہنیت کی تشکیل واقعات نے کی تھی، لیکن موخرالذکر طبقہ خصوصاً اس کے نوجوانوں کو متاثر کرنے میں سر محمد اقبال کا اہم حصہ ہے۔ ابتدا میں اقبال نے اردو میں پرزور نظمیں لکھیں، جو بہت مقبول ہوئیں، جنگ بلقان کے دوران میں، انہوں نے اسلامی موضوع اختیار کئے، وہ اپنے زمانہ کے حالات اور مسلمانوں کے عام جذبات سے متاثر ہوئے، اور خود انہوں نے ان حالات و جذبات پر اثر ڈالا، گہرا اور شدید، لیکن وہ عوام کی قیادت نہیں کر سکتے تھے، وہ ایک شاعر، عالم، اور فلسفی تھے، اور پرانے جاگیرداری نظام سے وابستہ تھے، نسل کے اعتبار سے وہ کشمیری برہمن تھے، انہوں نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے، ایک فلسفیانہ نظریہ مہیا کر دیا، اور ان میں تفریحی رجحان پیدا کر دیا، یوں تو ان کی ہر دل عزیزی، ان کے کمال شاعری کی وجہ سے تھی، لیکن اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلم ذہن کی اس ضرورت کو پورا کر رہے تھے کہ اسے اپنے لئے ایک لنگر مل جائے۔ قدیم اتحاد اسلامی کا خیال اب بے معنی ہو چکا تھا۔ خلافت ختم ہو چکی تھی۔ سب اسلامی ملکوں میں خصوصاً ترکی میں، قومیت پرستی کا زور تھا، اور انہیں ایک دوسرے کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ قومیت کا تصور ایشیا پر یورپ و امریکہ کی طرح چھا چکا تھا۔ ہندوستان میں قومی تحریک زور پکڑ چکی تھی، اور برطانوی حکومت کو بار بار للکار چکی تھی۔ یہ

قومیت ہندوستانی مسلمانوں کے دل کو لگتی تھی، اور آزادی کی جد و جہد میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت نے حصہ لیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی اس قومی تحریک میں ہندوؤں کا غلبہ تھا، اور اس پر انہی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ اس لئے مسلم ذہن میں، ایک کشمکش پیدا ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے اس قومیت کو قبول کر کے یہ کوشش کی کہ اس پر اپنا اثر ڈالیں۔ بہت سے اس تحریک سے ہمدردی رکھنے کے باوجود حیص بیص کے عالم میں اس سے الگ رہے، اور انہوں نے تفریق کا راستہ اختیار کیا، جس کی طرف اقبال کے فلسفہ اور شاعری نے ان کی رہنمائی کی تھی۔"

جواہر لال کے الفاظ میں "اقبال کے فلسفے اور شاعری نے تفریق کی طرف رہنمائی کی" یا ہند کے مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ، عالم اسلام میں تجدید و احیائے دین، اور دنیا میں ایک قابل غور نظام حیات کی موجب ہوئی، اس کا فیصلہ تو آنے والا مورخ کرے گا، لیکن اس سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کے فلسفے اور شاعری ہی نے پاکستان کا قیام ممکن بنایا، اور اقبال کے فلسفے اور شاعری ہی کی بنا پر مستقبل کے عالم اسلام کی تشکیل ہو گی۔

اب ہم اقبال کی شاعری کے دوسرے دور یعنی "ملیت" اور "بین الاسلامیت" کے مختلف پہلوؤں پر غور کریں گے۔

(۱)

تہذیبِ حجازی کا مزار

اقبال کے دل پر "اسلامیت" کی شاید سب سے پہلی چوٹ اس وقت لگی، جب وہ

ہندوستان سے یورپ کے سفر پر مزید طلب علم کے لیئے روانہ ہوئے، قومیت اور وطنیت کے دور میں بھی، اسلام اور مسلمانوں سے، انہیں ربط و تعلق تو بہرحال تھا، اس سفر میں ان کا جہاز سسلی (صقلیہ) کی طرف سے گزرا، اور فوراً ہی ان کا ذہن تاریخ ماضی کے اوراق الٹنے لگا، انہیں یاد آیا، ایک صحرا نشیں قوم، علم کی روشنی، اور تہذیب کا تحفہ لیکر کبھی یورپ کے ظلمت کدہ میں پہنچی تھی، اور اس کے آتے ہی وہاں کے بام و در روشن ہو گئے تھے، جگمگانے لگے تھے۔ اس جزیرہ (سسلی) میں ان کی شاندار مسجدیں تھیں جہاں سے تکبیر و تہلیل کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ فلک بوس، اور فلک رفعت ایوان و قصور تھے، جہاں ہر انسان کے ساتھ، خواہ وہ کسی دین و ملت کا ہو، یکساں اور مساویانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ یہیں کا ایک غلام (جوہر صقلی) مسلمان ہو کر، اليسا سربلند اور سرفراز ہوا کہ اپنا لشکر گراں لے کر آگے بڑھا، تو مغرب اقصیٰ سے نکل کر، شام میں جا کر دم لیا۔ اس کا بنایا ہوا قاہرہ جیسا باعظمت شہر، آج تک موجود ہے۔ اس کی قائم کی ہوئی ازہر یونیورسٹی (جامعہ ازہر مصر) آج بھی نہ صرف عالم اسلام کی، بلکہ دنیا کی سب سے بڑی اقامتی (ریزیڈنشل) یونیورسٹی ہے۔

لیکن زمانہ کی گردش اپنا کام کرتی رہی۔ جوہر اپنے کارنامے دکھا کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کی قوم بھی، صقلیہ سے نکال دی گئی۔ اس قوم کی عمارتیں ڈھادی گئیں، مسجدیں مسمار کر دی گئیں، تہذیب ختم کر دی گئی، مذہب مٹا دیا گیا۔ اقبال کی چشم تصور نے آن کی آن میں یہ سب دیکھ لیا۔ شاعر کی پونجی اشک و حسرت کے سوا کیا ہوتی ہے؟۔ اس نے ایک نظم اس موضوع پر کہی جس کے چند شعر یہ ہیں :۔

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار!
وہ نظر آتا ہے، تہذیب حجازی کا مزار،
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی،
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی،
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اِک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور،
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

(۲)

حصارِ ملّت

"اسلام اور وطن" سے متعلق ابھی اقبال کے تصورات نے پختگی نہیں حاصل کی تھی، لیکن بہرحال ان کا ایک سانچہ بن رہا تھا، اور کبھی کبھی ایہ سوچنے اور کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے:-

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

کہاں کا آنا کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

(۳)

خدا کی بستی دکاں نہیں ہے!

مسلم ممالک، اور مسلم اقوام پر، اہل فرنگ کی چیرہ دستیوں، اور سفاکیوں کے مناظر دیکھ کر اقبال کانپ اٹھتے ہیں، لیکن مسلمانوں کی تاریخ ماضی، انہیں ایک نئی امید اور نئے ولولہ سے ہمکنار کرتی ہے، وہ سوچتے ہیں، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، کیا مسلمانوں کی تاریخ جلال کا اعادہ نہیں ہو گا؟ ضرور ہوگا، دنیا کے حالات ایسے ہیں کہ ہونا چاہئیے ——— چند شعر :-

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا، پھر استوار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنالے گا قافلہ مورِ ناتواں کا

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

(۴)

ترکیب مزاجِ روزگار

قوموں اور ملتوں کے زوال و انحطاط، اور مرگ و فنا کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار
ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدّت سے ہے، ترکیبِ مزاجِ روزگار

اور یہ فلسفۂ مرگ و حیاتِ اقوام و امم بیان کرتے کرتے اقبال کو، ملت اسلامیہ یاد آجاتی ہے، اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں :۔

آہ مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آزادی اٹھا، برسا، گیا،

پھر بھی قوم کی نشاۃ جدید اور حیاتِ نو سے مایوس نہیں ہیں :۔

دہر کو دیتے ہیں موتی دیدۂ گریاں کے ہم
آخری بادل ہیں اک گذرے ہوئے طوفاں کے ہم
ہیں ابھی صدہا گہر اس ابر کی آغوش میں
برق ابھی باقی ہے اس کے سینۂ خاموش میں

(۶)

ملّت کے نوجوانوں سے!

جس قوم نے دنیا کی تاریخ بدل دی تھی اس قوم کے نوجوان اپنے ماضی سے نا آشنا اپنے حال سے بے خبر اپنے مستقبل سے بے پروا غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ غلامی اگر صرف جسمانی ہوتی تو اتنی المناک نہیں تھی جتنی ذہنی اور فکری غلامی، دردِ دل سے بیتاب ہوکر اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہیں:۔

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبّر بھی کیا تُو نے
وہ کیا گردوں تھا جس کا تو ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاجِ سرِ دارا
تمدّن آفریں، خلّاقِ آئینِ جہاں داری!
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارہ
سماں "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے بخشش کا نہ تھا یارا
غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے؟
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا!

اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے وہ نظارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا

(۸)

شمع و شاعر

اسی پُر آشوب زمانہ میں اقبال نے اپنی مشہور و معرکہ آرا طویل نظم "شمع و شاعر" لکھی۔ کون انسان ہے جو جذبات سے متاثر نہ ہو؟ اور شاعر کی زود حسی، اور جذباتیت تو انتہا نہیں رکھتی عالم اسلام پر پے بہ پے جو حوادث ٹوٹ رہے تھے انہوں نے اقبال کے قلب حساس کو زیر و زبر کر رکھا تھا وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی بے بسی، تباہی اور بربادی دیکھ رہے تھے مگر کچھ نہیں کر سکتے تھے فرنگی استبداد اور قہرمانیت کے نمونے ان کی نظر کے سامنے تھے اور یہ دیکھ کر ان کا دل خون ہوا جاتا تھا کہ ہر جگہ، ہر مقام، ہر ملک میں مسلمان مظلوم بنائے جا رہے تھے۔ انہیں فنا کرنے کی منظم کوششیں کی جا رہی تھیں۔ یہ دلدوز حالات دیکھ کر اقبال شمعِ سوزاں سے مخاطب ہوتے ہیں اپنی کہتے ہیں، اس کی سنتے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں، کہ مسلمانوں کی حیاتِ نو کا دورِ جدید جلد شروع ہونے والا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی،
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار،
نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی،
دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود،
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی،
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

(۱۵)

جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں!

اقبال نے جتنا زوردار شکوہ لکھا تھا اس سے کہیں زیادہ زوردار "جوابِ شکوہ"

لکھا ہے۔ خدا سے بندے نے جو شکایت کی تھی بندے کو خدا نے اس کا جواب دیا ہے اس میں مسلمانوں کی پستی، انحطاط، ادبار اور زوال کے اسباب و عوامل شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ مسلمان اگر مسلمان ہو جائے تو اس کی درماندگیاں آج ختم ہو جائیں، لیکن جب تک وہ اسلام کو اپنی زندگی نہیں بنا لیتا اسے کسی طرح کے شکوہ و شکایت کا حق نہیں۔

(۱۶)

بادۂ تہذیبِ حاضر

مسلمانوں کے لئے فرنگی تہذیب و معاشرت کو اقبال زہر ہلاہل سمجھتے ہیں، وہ اسلام کو ایک دستور حیات مانتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان اس دستور کو اپنا لیں اور اپنی زندگی اسی سانچہ میں ڈھال لیں۔ تہذیب حاضر کی سمیّت پر وہ نئے نئے انداز میں طنز کیا کرتے تھے! :-

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیبِ حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تنِ خاکی
کیا ذرّہ کو جگنو دے کے تاب مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتابِ جلوہ فرما کی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بے باکی
تغیّر آ گیا ایسا تدبر میں، تخیّل میں

ہنسی سمجھی گُل گلشن میں غنچہ کی جگہ جاکی
حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خودفروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی
فروغِ شمع نو سے بزمِ مسلم جگمگا اُٹھی،
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی
تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمعِ محفلے داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلے داری

(۱۹)

خضرِ راہ

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اور پھر اس کے اختتام کے بعد عالم اسلام پر پے بہ پے نزولِ بلا ہوتا رہا، شریف مکہ، حسین (شاہ حسین، بادشاہ شرق اردن اور شاہ فیصل فرماں روائے عراق کے پردادا) نے غداری کی ترکوں کو دھوکا دیا اور انگریزوں سے مل گیا۔ حکومت ترکیہ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہو گئی مصر پر فرنگی پنجہ اور مضبوط ہو گیا دوسرے اسلامی ممالک بھی، ہلاکت ادبار اور انحطاط سے دوچار ہوئے ہندوستان کے مسلمان خاص طور پر ان حوادث سے بہت متاثر ہوئے وہ غلام تھے لیکن اپنے مسلمان بھائیوں اور مسلمان ملکوں کے حفظ و بقا کے لئے کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتر چکے تھے قید و بند کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا دار و رسن کی حکایت پھر سے دہرائی جا رہی تھی اقبال بھی ان حالات و حوادث سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں

نے کئی معرکہ آرا اور طویل نظمیں اس دور میں سپرد قلم کیں، انہیں میں ایک "خضر راہ" بھی ہے۔ اقبال خضر سے رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں، وہ انہیں سیاست کے پیچ و خم سے آگاہ کرتا ہے حکومت اور سلطنت کے راز بتاتا ہے مسلمانوں کے دکھ درد کا درمان تجویز کرتا ہے سیاستِ فرنگ کی بازی گری اور زرگری کی عقدہ کشائی کرتا ہے انسان نے خدائی نظام کو چھوڑ کر اپنی ناقص فکر و نظر کی رہنمائی میں جو نئے نظام بنائے ہیں ان کی کمزوری اور لغویت آشکار کرتا ہے۔

(۲۰)

طلوعِ اسلام

پہلی جنگ عظیم کے پیدا کئے ہوئے روح فرسا، ہمت شکن یاس انگیز اور مرگ آفریں حالات بلاشبہ مسلم ممالک کے لئے ایک بہت بڑے المیہ کی حیثیت رکھتے تھے یہی وہ حالات تھے جب محمد علی نے ایک مرتبہ خودکشی کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا متعدد مسلمان اکابر ہجرت کر گئے تھے بہت سے لوگوں نے خانہ نشینی اور گوشہ گیری کی زندگی اختیار کر لی تھی ایک عام اضمحلال ہر طرف چھایا ہوا تھا مایوسی کی ایک لہر تھی جو تمام مسلمانوں پر چھائی ہوئی تھی۔

لیکن اقبال کی کیفیت سب سے جدا تھی وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں خورشید جہاں تاب کی جلوہ گری دیکھ رہے تھے وہ مایوسی کے عالم میں بھی امید کا دامن چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے تھے وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور نہیں کر سکتے تھے کہ مسلمان مٹ سکتے ہیں، اسلام فنا ہو سکتا ہے محمدؐ کے نام لیواؤں پر موت طاری

ہو سکتی ہے۔ اس عہد پُر آشوب میں انہوں نے ایک اور معرکہ آرا نظم "طلوع اسلام" لکھی جو اپنے کیف و اثر اور جوش بیان اور زور زبان کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہے۔

(۲۱)

"مسلمِ ہندی شکم را بندہ!"

جس مسلمان میں اقبال ذرا دم خم تیور اور بانکپن دیکھتے تھے اس کو اپنی امید کا سہارا بنا لیتے تھے، امان اللہ خاں بادشاہ افغانستان کا آغاز بڑا شاندار تھا اقبال نے ایسا محسوس کیا جیسے امان اللہ کی صورت میں گوہر مقصود مل گیا۔ پیام مشرق میں پہلے تو اس کے سامنے حجاز، مصر، ترکیہ، ایران اور ہندوستان کا دلفگار نقشہ کھینچتے ہیں پھر اُسے کچھ نصیحتیں کرتے کرتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ دین کو اپنا لے دنیا تیرے قدموں پر خود بخود سر جھکا دے گی:۔

ابطحی در دشتِ خویش از راہ رفت
از دمِ او سوزِ الا اللہ رفت
مصریاں افتادہ در گردابِ نیل
سست رگ تورانیان ژندہ پیل
آلِ عثمان در شکنجِ روزگار
مشرق و مغرب ز خونش لالہ زار
عشق را آئینِ سلمانی نماند
خاکِ ایراں ماند و ایرانی نماند

سوز و سازِ زندگی رفت از گلش
آن کہن آتش فسرد اندر دلش
مسلمِ ہندی شکم را بندۂ!
خود فروشے، دل ز دیں برکندۂ

(صلا)

اس کے بعد امان اللہ کو اُبھارتے ہیں:-

سروری در دینِ ما خدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقرِ حیدری است
در ہجومِ کارہائے ملک و دیں،
با دلِ خود یک نفس خلوت گزیں
ہر کہ یک دم در کمینِ خود نشست
ہیچ نخچیر از کمندِ او نجست
در قبائے خسروی درویش زی
دیدۂ بیدار و خدا اندیش زی

(صف)

(۲۲)

نشاطِ باغ

کشمیر بجائے خود خطۂ جنت نظیر ہے اور وہاں کا نشاط باغ اس جنت کا دل

ہے اقبال کشمیر جاتے ہیں وہاں کے حالات دیکھ کر ان کا دل لرز اٹھتا ہے وہاں کی مسلم اکثریت کی درماندگی دیکھ کر ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے پھر ایک روز وہ نشاط باغ جاتے ہیں وہاں پہنچ کر محسوس کرتے ہیں یہی وہ جگہ ہے جس کا چپہ چپہ دامانِ باغبان، اور گوشہ گوشہ کف گل فروش ہے، ان پر سرخوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن جلد ہی یہ کیفیت نالۂ دلدوز کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور وہ کشمیر اور کشمیریوں کی نوحہ خوانی شروع کر دیتے ہیں۔

چہ خواہم درین گلستاں گر نہ خواہم
شرابے، کتابے، ربابے، نگارے،
بہ ساغر فروریز آبے کہ جاں را
فروزد و چوں ذرے بسوزد چنارے
نہ بینی کہ از کاشغر تا بہ کاشان
ہماں یک نوا بالد از ہر دیارے
ز چشم اُمم بخت آں اشک نابے
کہ تا ثیر او گل دماند زخارے،
کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ!
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے
خودی ناشناسے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ او

نصیبِ تنش جامۂ تار تار ہے،

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے

نہ در سینۂ او دلِ بے قرارے

(صفحہ ۱۳۴)

(۲۳)

غُلامی

انسان اور انسان کا غلام؟ اقبال اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہ انسان کا ہر جرم معاف کر سکتے ہیں لیکن جرمِ غلامی کا معاف کرنا ان کے لئے ناممکن ہے:-

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد!

گوہرے داشت و لے نذرِ قباد و جم کرد

یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است

من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے خم کرد

(صفحہ ۱۵۷)

(۲۴)

مجلسِ اُمم

پہلی جنگِ عظیم کے بعد مجلسِ امم (LEAGUE OF NATIONS) کی جنیوا میں تشکیل ہوئی اس مجلس کا مقصد یہ تھا کہ کمزور قوموں کو طاقتور قوموں سے بچائے،

لیکن یہ طاقت ور قوموں کی آلۂ کار بن گئی۔ مصر، عراق، شام، فلسطین، لبنان، اور آخر میں حبش پر برطانیہ، فرانس اور اطالیہ کی طرف سے جتنے بے پناہ مظالم ہوئے، ان سے کون ناواقف ہے؟ لیکن مجلس اقوام صرف ایک کام میں مصروف رہی یہ کہ کمزور قوموں کو طاقتور قوموں کی جیب میں ڈال دیا جائے۔ یہ دیکھ کر اقبال نے طنز کا تیر چلایا جو ٹھیک نشانہ پر بیٹھا:-

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن
دردمندانِ جہاں، طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند!

(صفحہ ۲۲۳)

نقشِ فرنگ

یادِ ایّامے کہ بُودم در خمستانِ فرنگ
جامِ اُو روشن تر از آئینۂ اسکندر است
چشمِ مستِ مے فروشش بادہ را پروردگار
بادہ خواراں را نگاہ ساقی اش پیغمبر است
جلوۂ او بے کلیمؑ و شعلۂ او بے خلیلؑ
عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارتگر است

○

نقشِ فرنگ

فرنگی تہذیب و تمدن، فرنگی آداب حیات و معاشرت، فرنگی اصولِ سیاست و تدبیرِ مدن، ہر چیز کے اقبال مخالف ہیں۔ انسان کی زبوں حالی، اخلاقی پستی، اقدار کی ابتری، یہ سب چیزیں فرنگی مدنیت کے فتوحات میں شامل ہیں۔ اقبال نے انگریزوں کے خلاف تحریک ترکِ موالات میں عملی حصہ نہیں لیا۔ لیکن ان کی شاعری کا پیام فرنگیت کے خلاف بغاوت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ فرنگیت کے خلاف وہ چوکھی لڑائی لڑتے ہیں ایک طرف تو دنیا کو وہ اس کی ستم گری اور سفّاکی کے خلاف متنبہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کو فرنگیت کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کی تلقین کرتے ہیں، تیسری طرف وہ علمی انداز میں سحرِ فرنگ کی طلسم کشائی کرتے ہیں، چوتھی طرف طنز و تعریض کے ایسے بھرپور وار دانش افرنگ، اور تہذیب مغرب کے خلاف کرتے ہیں۔ کہ ان کا کوئی توڑ ممکن ہے نہ جواب۔

تفریقِ ملل یا ملّتِ آدم؟

اسلام کے نظریۂ حیات میں اور دانش ورانِ فرنگ کے اقدارِ زندگی میں زمین و

آسمان کا فرق ہے ان دونوں میں کبھی توافق نہیں ہو سکتا کبھی ہم آہنگی نہیں پیدا ہو سکتی کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا۔

جینوا کی مجلس اقوام تفریقِ ملل کا اکھاڑہ ہے یہاں رنگ و نسل کی بنیاد پر قومیت کی حدیں قائم کی گئی ہیں یہاں عدل نہیں، انصاف نہیں، کمزور بہر حال ناحق پر ہے اور طاقت ور ہر صورت میں بر سر حق ہے، اقوام کا دوسرا مرکز مکّہ ہے جہاں نہ حسب نسب کی پوچھ ہے نہ رنگ و نسل کا امتیاز اس حرم میں جو پہنچ گیا وہ ایک عظیم برادری کا رکن بن گیا، اقبال اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

اِس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
(ض ۵)

اُخوّت کا اِنحصار ـ نسب پر یا دین پر؟

اسلام اخوت کی بنیاد دین کو قرار دیتا ہے جس نے کلمۂ شہادت پڑھ لیا۔ وہ اسلامی برادری کا رکن ہے، خواہ وہ سوڈان کا رہنے والا ہو یا روس کا، حبش کا یا انگلستان کا۔ لیکن یورپ اخوّت کی بنیاد نسل اور نسب کو قرار دیتا ہے وہ کوئی مذہب بھی اختیار کرلے لیکن رنگ، نسل اور نسب کے جو بت اس نے بنا رکھے ہیں، ان کی پوجا نہیں چھوڑ سکتا اقبال اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں :۔

ضمیر اِس مدنیت کا دین سے ہے خالی
فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پر قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں
قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دینِ مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

(صفحہ ۶۰)

لیکن سحرِ افرنگ سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں اقبال بشارت دیتے ہیں:-

غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور ترا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ

(صفحہ ۶۴)

اور یہ مغرب جس سے مسلمان مرعوب ہیں خود کیا ہے؟

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

(صفحہ ۶۷)

اور یہ مغربی تہذیب جس کا ڈنکا چاردانگ عالم میں بج رہا ہے کیا ہے؟

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیرِ پاک، خیالِ بلند و ذوقِ لطیف
(صفحہ ۶۹)

عصرِ حاضر

عصرِ حاضر جو تمام تر عصرِ فرنگ ہے کم از کم اسلامی نقطۂ نظر سے ایک بے جان بے روح اور بے کردار دور ہے اس میں سب کچھ ہے مگر خدا شناسی اور خدا پرستی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ترقیوں کا انجام خوشگوار نہیں المناک ہوتا ہے۔ انسان آسمان پر اڑ رہا ہے مگر انسانیت پستی کے گڑھے میں گرتی چلی جا رہی ہے۔ عقل ایجاد و اختراع میں مصروف ہے اور روح نوحہ و ماتم میں۔

لادینیِ افکار

لادینیِ افکار اور بے ربطیٔ افکار کا تجزیہ:-

مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام (صفحہ ۸۱)

دین و تعلیم

یورپ کے نظامِ تعلیم پر ایک نظر:-

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروّت کے خلاف

(صفحہ ۸۵)

فرنگی معاشرت

فرنگی معاشرت کی بے بسی :۔

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں
قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بیچارہ زن شناس نہیں

(صفحہ ۹۰)

ایک سوال

کتنا چبھتا ہوا سوال ہے :۔

کوئی پوچھے حکیمِ یورپ سے
ہند و یونان ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال ؟

مرد بے کار و زن تہی آغوش ؟

(صـ۹۰)

عورت اور تعلیم

تہذیب فرنگ نے عورت کو چراغ خانہ نہیں رکھا، شمع محفل بنا دیا :۔

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انسان کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی بات کو ارباب نظر موت

(صـ۹۵)

"خودی" کا قتل

فسونِ فرنگ کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیہ کے اونچے اور تعلیم یافتہ طبقہ نے قوم کو فراموش کر دیا ہے ذات کو پیش نظر رکھا ہے اور ذاتی سربلندیوں کے مقصد پر "خودی" کو قربان کر دیا ہے اور اقبال کے نزدیک خودی کے بغیر زندگی بیکار ہے :۔

ہوا ہے بندۂ مومن فسونیِ افرنگ
اسی سبب سے قلندر کی آنکھ ہے نمناک
ترے بلند مناصب کی خیر ہو یا رب
کہ ان کے واسطے تو نے کیا خودی کو ہلاک

(صـ۱۴۱)

سیاستِ افرنگ

فرنگی سیاست کو اقبال بارگاہِ الٰہی کا حریف قرار دیتے ہیں، خدا نے صرف ایک ابلیس بنایا تھا مگر فرنگی سیاست نے ہزارہا ابلیس پیدا کر ڈالے جنھوں نے خدا کی اس وسیع دنیا کو فسق و فجور اور جنگ و جدال کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے :۔

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

(ص ۱۴۴)

ابلیس کا فرمان

خدا ترسی اور خدا پرستی، امن و عافیت، فلاح و نجاح، انسانیت کی بلندی، اور اقدارِ انسانی کی رفعت، ابلیس کے لئے ناقابلِ برداشت ہے وہ چاہتا ہے کہ یہ کارگاہِ عالم، افتراق و انتشار کا مرکز بن جائے چنانچہ وہ اپنے سیاسی فرزندوں یعنی سیاستِ فرنگ کے پرستاروں کو حکم دیتا ہے :۔

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا

روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملّا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

(ص ۱۴۸)

جمعیتِ اقوام کا جواب!

جینوا میں فرنگی سیاست نے "بہر تقسیم قبور" ایک انجمن بنائی اور اس کا نام جمعیتہ اقوام رکھا، یہ انجمن بنی اس لئے تھی کہ زیر دستوں کو زبردستوں کے آزار سے محفوظ رکھے لیکن اس نے کیا کیا کہ زبردستوں کو زیر دستوں کا آقا و مولیٰ بنا دیا۔

فرنگی سیاست کی یہ کرشمہ سازی دیکھ کر اقبال نے ایک خواب دیکھا، ایک غلام ملک کا شاعر خواب ہی دیکھ بھی سکتا تھا وہ خواب یہ تھا کہ مشرقی اقوام کی ایک الگ جمعیتہ امم بنے اور اس کا مرکز اپنے محلِ وقوع کی اہمیت کے لحاظ سے طہران ہو۔ شاعر کی زندگی خواب ہی دیکھنے گزرتی ہے لیکن جو شاعر قلبِ تپاں، روحِ سوزاں اور چشمِ نمناک کا

حاصل ہوا اس کے خواب حقیقت کا جامہ بھی پہن لیتے ہیں۔ اقبال نے پاکستان کا خواب بھی دیکھا تھا لیکن اب پاکستان ایک خواب نہیں ٹھوس اور اٹل حقیقت ہے۔ طہران کے بارے میں بھی اقبال نے ایک خواب دیکھا تھا اور کیا عجب کہ یہ خواب بھی جلد ہی ایک تابناک حقیقت بن جائے :۔

پانی بھی مسخّر ہے ہَوا بھی ہے مسخّر
کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب
ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جینوا
شاید کُرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

(ص ۱۷۹)

مشرق و مغرب

مشرق و مغرب کے اقدار میں اتنا فرق ہے کہ اسے ایک انگریزی کے الفاظ میں واضح کیا جا سکتا ہے "مشرق مشرق ہے، اور مغرب مغرب، اور یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے!" غور کیجئے تو یہ افتراق صرف سیاسی ہی نہیں ہے، تہذیبی، معاشرتی اور روحانی بھی ہے اقبال نے اس چیز کو بار بار واضح کیا ہے :

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آذرانہ

(بالِ جبریل ص ۲۴)

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا، وہاں بے ذوق ہے صہبا
(ص ۳۸)

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے 'لا' سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ 'الّا'
(ص ۳۸)

گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ
دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
(ص ۴۳)

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے
(ص ۵۲)

یہ حوریان فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشت مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب
(ص ۵۶)

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ
(ص ۷۶)

میخانۂ یورپ کے دستور نرالے ہیں،
لاتے ہیں سرور اوّل دیتے ہیں شراب آخر

(ص۷۷)

دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک!

دانشِ حاضر یعنی دانشِ افرنگ پہ اقبال جو بھرپور وار کرتے رہتے ہیں اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اُسے مسلمانوں ہی کے لئے نہیں عالم انسانیت کے لئے مہلک اور تباہ کن سمجھتے ہیں، وہ ایوانِ فرنگ کو "سست بنیاد" بھی سمجھتے ہیں اور "آئینہ دیوار" بھی چنانچہ جن لوگوں کو وہ اپنا مخاطب سمجھتے ہیں، انہیں بار بار یہ حقیقت ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتے ہیں:۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

(ص۹۵)

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

(ص۹۹)

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

(ص۹۳)

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے
(ص۹۳)

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا
دماغ روشن و دل تیرہ و نگاہ بے باک
(ص۹۷)

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
(ص۱۰۰)

نئی تہذیب تکلّف کے سوا کچھ بھی نہیں
چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش
(ص۱۰۸)

ترک و ایران و عرب مستِ فرنگ!

سب سے زیادہ دکھ اقبال کو یہ ہے کہ "ترک و ایران و عرب" ذہنی اور فکری، تہذیبی اور علمی، طور پر بھی یورپ کی غلامی میں مبتلا ہو چکے ہیں، حالانکہ یورپ اگر کسی کو کچھ دے سکتا ہے تو صرف موت نہ کہ زندگی:-

شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق رمید
(جاویدنامہ ص۳۵)

در ضمیر ملت گیتی شکن ــــــ!
دیدہ ام آویزش دین و وطن،
(ص ۶۶)

روح در تن مردہ از ضعفِ یقین
نا امید از قوت دین مبین
(ص ۶۷)

ترک و ایران و عرب مست فرنگ
ہر یکے را در گلو شست فرنگ
(ص ۶۷)

مشرق از سلطانی مغرب خراب
اشتراک از دین و ملت بردہ تاب
(ص ۶۷)

وائے بر دستورِ جمہور فرنگ
مردہ تر شد مردہ از صور فرنگ
(ص ۶۹)

"ما متاع و ایں ہمہ سوداگران"

اور ہم جو تقلید فرنگ پر مٹے ہوئے ہیں، اس کی آنکھ سے دیکھتے، اس کے کان سے سنتے اور اس کے دماغ سے سوچتے ہیں، کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ

اس نیاز مندی کا صلہ ہمیں کیا ملا؟ صرف یہی تو کہ یورپ سوداگر بن گیا ہے اور ہمیں بکاؤ مال سمجھ کر بولی بولتا رہتا ہے اور ہم کبھی اس حقیقت پر بھی غور نہیں کرتے کہ جس یورپ کو ہم نے اپنا امام و پیشوا بنا لیا ہے وہ خود تہذیبی اور معاشرتی اعتبار سے کس درجہ پست زندگی گذار رہا ہے؟ اور نہ یہ سوچنے کی کبھی توفیق ہوتی ہے کہ ہمارے پاس اسلام کی دی ہوئی جو دولت و نعمت تھی اس سے ہم خود کیوں نہیں مستفید ہوتے؟ اور دنیا کو کیوں نہیں اس دولت لازوال کا حصہ دار بناتے۔؟

فاش باید گفت سرِّ دلبران
ما متاع و این ہمہ سوداگران

(ص۹۷)

تقلیدِ فرنگ

مصطفےٰ کمال پاشا کی زیر قیادت ترکوں کی نہضت بہت شاندار تھی انہوں نے اپنے غداروں اور منافقوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا داخلی اور خارجی شورشوں اور فتنوں سے ذرا ہراساں نہ ہوئے اور ان کی سرکوبی کرکے رہے۔ خارجی طور پر یونان کی ہنگامہ آرائیاں اور فتنہ طرازیاں بلقانی ریاستوں کی بغاوتیں اور شورشیں، داخلی طور پر ارمنوں اور یہودیوں کی سازشیں اور شرارتیں، ان سب چیزوں کا انہوں نے کامیاب مقابلہ کیا، اتحادی حکومتوں اور خاص طور پر برطانیہ کی ہوس انتقام نے ترکیہ پر حملہ کیا اور قریب تھا کہ آزاد ترکیہ کا وجود ختم ہو جاتا اور اس اسلامی ملک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جاتے اور یہ

ٹکڑے اتحادی حکومتیں آپس میں تقسیم کر لیتیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال کی تلوار اور عزم نے اس فتنہ کا سر بھی کچل دیا۔

مصطفےٰ کمال نے یہ سب کچھ کیا لیکن تقلیدِ فرنگ کے شکنجہ میں ملک کو ایسا پھنسایا کہ زندگی موت سے بدتر ہو گئی۔ دین، عزت، ملی عصبیت ختم، افکارِ دینی خارج البلد (خدا کا شکر ہے اب یہ صورت نہیں ہے۔) اقبال اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر کتنے پتہ کی بات کہتے ہیں :۔

بدن را تا فرنگ از جان جدا دید
نگاہش ملک و دین را ہم دو تا دید
کلیسا سبحہ پطرس شمارد،
کہ او با حاکمی کارے ندارد،
بکارِ حاکمی مکر و فنے بیں،
تن بے جان و جان بے تنے بیں
خرد را با دلِ خود ہمسفر کن،
یکے بر ملتِ ترکان نظر کن
بہ تقلیدِ فرنگ از خود رمیدند
میان ملک و دین ربطے ندیدند

خراباتِ فرنگ

فرنگ کا اقبال جب ذکر کرتے ہیں اس کی تحلیل نفسی مزید کرتے ہیں اس کی

ان تاریکیوں کو جن کی خود اسے خبر نہیں، روشن اور اجاگر کر دیتے ہیں، خراباتِ فرنگ، پیام مشرق کی ایک نظم ہے، چند شعر:۔

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ
شوخ گفتاری رندے ولم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی درِ دے
صحبت دخترک زہرہ وش و نائے و سرود
ایں خرابات فرنگ است و ز تاثیرِ مئش
آنچہ مذموم شمارند نماید محمود
نیک و بد را بترازوئے دگر سنجیدم
چشمہ داشت ترازوئے نصاری و یہود
خوب زشت است اگر پنجہ گیرات شکست
زشت، خوب است اگر تاب و توانِ تو فزود

غلامی

غلامی کیا ہے ذوقِ حُسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا!

(۳)

غُلامی

"از غلامی فطرتِ آزاد را رُسوا مکُن"

ملّت اسلامیہ کے ہر روگ اور آزار کا واحد سبب اقبال کی نگاہ میں "غلامی" تھا۔ ان کا یہ مستقل عقیدہ تھا

کہ غلامی سے بدل جاتا ہے قوموں کا شعور

وہ غلامی کو موت اور آزادی کو زندگی قرار دیتے تھے

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی۔!

اور زندگی کے بارے میں ان کا یہ نظریہ تھا کہ یہ زوال پذیر نہیں ہوتی،

جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

لیکن مسلمان قوم نہ صرف یہ کہ غلام تھی بلکہ غلامی پر قانع بھی تھی اور یہی بات بہت زیادہ تکلیف دہ تھی اقبال اسے بھی گوارا نہیں کرتے کہ انسان انسان کا غلام اور محکوم ہو،

تعجب ہے کہ انساں اور انساں کا شکاری ہو

لیکن اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ مسلمان غیر مسلم کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال سکتا تھا جو قوم "خیر امم" بن کر نمودار ہوئی ہو جیسے قرآن نے خیر امّت کا لقب دیا ہو جس نے اپنے دور کشورکشائی میں صدیوں کے غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی ہو جو اپنے عہد فرماں روائی میں غیر مذہب والوں کے ساتھ بھی رواداری اور مساوات کا سلوک کرتی رہی ہو، وہ غلام ہو جائے؟ غلامی پر قانع ہو جائے؟ اور اپنے اقدار ملی کو فراموش کر کے ایک دوسری تہذیب ایک دوسرے نظام حیات اور ایک بالکل اجنبی اور غیر مانوس ملت کے آگے سر تسلیم خم کر دے، یہ اتنا بڑا المیہ تھا کہ قیامت کی ہولناکیوں کا اس کے مقابلہ میں برداشت کر لینا آسان تھا۔

اقبال کی شاعری نے جو غلامی کے خلاف مستقل اعلان جہاد تھی محمد علی اور شوکت علی جیسے آزادی کے کارواں سالاروں کو اپنا عقیدت مند بنا لیا، ملت اسلامیہ کو وہ متنوع اور متعدد طریقوں سے اس طرز زندگی کے خلاف بغاوت اور انقلاب پر اکساتے رہے، کبھی ناصح مشفق کے روپ میں کبھی واعظ شیریں مقال کی حیثیت سے۔ ان کے اشعار کبھی سیلیٔ استاد بن جاتے ہیں، کبھی شمشیر جگر دار وہ کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ مسلمان غیروں کے غلام ہوں اور اپنی متاع دین و دانش سے دستبردار ہو جائیں۔

یوں تو شروع ہی سے اقبال غلامی کے خلاف صف آرا نظر آتے ہیں، بانگِ درا تک میں غلامی اور محکومی کے خلاف ان کے متعدد اشعار نظر آتے ہیں لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد جب انہوں نے فتح مند مغرب کی چیرہ دستیاں ظلم آرائیاں اور حشر انگیزیاں دیکھیں اور مسلمانان عالم کی تباہی و بربادی کے لرزہ خیز حوادث ایک حقیقت

کی صورت میں نظر کے سامنے آئے تو ان کی شاعری نے غلامی کے خلاف مستقل جہاد کی صورت اختیار کر لی اور یہ جہاد نہایت استقلال و عزیمت کے ساتھ زندگی کے آخری سانس تک کرتے رہے ایک لمحہ کے لیے بھی ان پر اضمحلال یا شکست خوردگی کا جذبہ طاری نہیں ہوا بستر مرگ سے بھی وہ یہی دعوت دیتے رہے کبھی طنز کر کے کبھی اصلاح و ہدایت کا رنگ اختیار کر کے کبھی شفقت اور محبت کے ساتھ کبھی جھنجلاہٹ اور برہمی کے ساتھ کبھی مثالیں دے کر کبھی تشبیہہ اور استعارے کے پردے میں کبھی تاریخ کا سہارا لے کر کبھی روایات و آثار کی روشنی میں، غرض یہی ایک پیام ہے جو مسلسل اور غیر منقطع طور پر جاری ہے! نہ اس کے زور میں کمی آتی ہے، نہ جوش میں، نہ اس کا رنگ بدلتا ہے، نہ تیور میں فرق آتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات!

محکومی کی لعنت اور آزادی کی نعمت بندۂ حر کے احوال و مقامات اور مجبور و محکوم کے خرافات و مزخرفات کا نقشہ اقبال یوں کھینچتے ہیں:۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

(ضرب کلیم ص۲۶)

حق و باطل یعنی آزادی اور غلامی کی کشمکش کا مرقع اقبال کا قلم یوں پیش کرتا ہے:۔

سرورِ جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیئے

جہاں میں بندۂ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیئے

مقامِ خضر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہیئے

مسلمانانِ متحدہ ہندوستان کو غلامی کے خلاف اور آزادی کے لیے یوں ابھارتے اور للکارتے ہیں:-

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

(صہ ۱۵)

ہندی مسلمانوں کی غلامی اور محکومی کا سب سے بڑا سبب اقبال کی نظر میں مرگِ خودی ہے:-

میسّر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لئے جہاں میں فراغ (صہ ۸۴)

"افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے"

درس حقیقت دیتے ہوئے مسلمان کو اقبال بتاتے ہیں، تو اپنی خودی سے دستبردار ہو گیا غلامی نے تجھے اسیر کر لیا غلامی انہی لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو خوئے غلامانہ پیدا کر چکے ہوں لہٰذا یورپ سے یہ شکایت بے کار ہے کہ اس نے تجھے اپنا غلام بنا لیا شکوہ تو تجھ ہی سے ہے کہ تو غلام بن گیا:۔

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف۔

(صفحہ ۵)

اقبال کو گلہ یورپ سے نہیں خود مسلمان سے ہے کہ وہ غلام بننے پر رضامند ہو گیا:۔

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر!
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تُو
مجھ کو تو گلا تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے (صفحہ ۱۵۲)

فلسطین پر یہودیوں کا تسلّط بڑھ رہا ہے فرنگی سیاست فلسطین کے اصل باشندوں کے شہری حقوق چھین رہی ہے اور غیر ممالک سے آئے ہوئے اجنبیوں کو مراعات سے نواز رہی ہے اقبال فلسطین کے مسلمان سے کہتے ہیں اگر خودی کا جوہر تیرے اندر پیدا ہو جائے تو اب بھی تو اپنی قسمت کا مالک بن سکتا ہے :-

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سُنا ہے میں نے غلامی سے اُمتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

(صفحہ ۱۶۳)

تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من!

علامہ اقبال کی طبع آزاد پر اتنی گراں ہے کہ وہ "گردشِ افلاک" کے پابند رہ کر بھی زندہ رہنا نہیں چاہتے نہ محکومیٔ انجم پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکتے ہیں، غلاموں کی بصیرت ان کے نزدیک ایک خرافات ہے مردِ حر کی بصارت ان کی نگاہ میں سب کچھ ہے غلامی کی ہر بات، ہر چیز، نامرغوب ہے آزاد کا ہر فعل ہر کام اُن کے نزدیک مستند اور مستحسن ہے، چند شعر :-

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی

جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا

(بالِ جبریل صفحہ ۳۲)

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

(صفحہ ۴۰)

من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

(صفحہ ۴۹)

کب تک رہے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردشِ افلاک نہیں ہے

(صفحہ ۵۳)

مُردِ جعفر زندہ رُوحِ اُو ہنُوز!

ہندوستان کی تاریخ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا اس سرزمین پر کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں نے جاہ و تمکنت اور دبدبہ و سطوت کے ساتھ

فرماں روائی کی۔ وہ جب اس دیس میں آئے تھے تو یہ صدہا ریاستوں اور رجواڑوں کا مجموعہ تھا جو ہمیشہ آپس میں برسر جنگ رہتی تھیں یا ایک دوسرے سے بے تعلق رہتی تھیں۔ تعاون، اشتراک اور وحدت فکر وعمل کی کوئی صورت نہیں تھی لیکن مسلمانوں نے اپنے دور فرماں روائی میں اس بکھرے ہوئے مجموعہ اقوام وملل کو ایک ملک بنادیا یہاں کی تہذیب، معاشرت، ثقافت اور اصول حیات میں زبردست انقلاب پیدا کیا وہ اپنے ساتھ اخوت اور مساوات انسانی کا تحفہ لائے وہ اپنے ساتھ رواداری اور وسعت قلب ونظر کی نعمت لائے وہ اپنے ساتھ ایک نئی تہذیب ایک نیا تمدن ایک نئی معاشرت اور نئی زبان لائے وہ اپنے ساتھ علم کی مشعل لائے جس نے تاریکی کو روشنی سے بدل دیا وہ اپنے ساتھ شاندار اور عظیم المرتبت عمارتوں کے نقشے لائے اور بہت جلد یہ نقشے پیکر خاکی میں تبدیل ہو گئے وہ اپنے ساتھ پھل لائے، پھول لائے، میوے لائے، انہوں نے باغات بنائے، نئے شہر بسائے ان کا ذوق تعمیر اس ملک کی تجدید واحیا کا سبب بنا وہ اپنے ساتھ سلا ہوا پر تکلف زرق برق لباس لائے وہ اپنے ساتھ صنعت وحرفت کی ایک نئی کارگاہ لائے اور ان کے جلوہ فرما ہوتے ہی اس ملک میں انقلاب آگیا رت بدل گئی کایا پلٹ گئی ایک نیا اور شاندار دور شروع ہوگیا۔

لیکن ان لازوال کارناموں کے باوجود وہ تباہ ہوئے ان کی حکومت کا آفتاب گہن میں آگیا ان کی سطوت کا چراغ بجھ گیا —— کیوں؟ جاہ پرستوں، خود غرضوں اور قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو مقدم رکھنے والے طالبان منصب ودولت کی بدولت۔

سراج الدولہ انگریزوں سے کبھی شکست نہ کھاتا اگر میر جعفر نے غداری نہ کی ہوتی ٹیپو سلطان قطعاً انگریزوں پر غالب آگیا ہوتا اگر میر صادق نے نمک حرامی کا ثبوت

نہ دیا ہوتا اودھ کی حکومت پر قبضہ کرنے کی انگریز جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے اگر علی نقی خان وزیر اعظم نے اپنے آقا کا ساتھ نہ چھوڑ دیا ہوتا، بہادر شاہ ظفر کی حکومت اس قدر جلد اور ایسے المناک حالات میں ختم نہ ہوتی اگر مرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سمدھی اور حکیم احسن اللہ بادشاہ کے وزیر مملکت نے انگریزوں کا ساتھ نہ دیا ہوتا۔ گویا ہندوستان کی غلامی اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی نتیجہ ہے وقت کے جعفر و صادق کی غداریوں کا۔ اقبال جعفر اور صادق کی غداری کو رمز (SYMBOL) کے طور پر استعمال کرتے ہیں یہ نام جیسے ہی زبان پر آیا وطن دشمنی قوم فروشی اور خود غرضی کا تصور بھی ساتھ ہی قائم ہو گیا۔

اقبال روحِ ہندوستان کا مشتاق دل اور منتظر آنکھ سے نظارہ کرتے ہیں اور تڑپ کر رہ جاتے ہیں ان کی چشم بینا دیکھتی ہے :-

آسمان شق گشت و حورے پاک زاد
پردہ را از چہرۂ خود بر کشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال،
حلۂ در بر سبک تر از سحاب،
تار و پودش از رگ برگ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند
بر لب او نالہ ہائے دردمند

(جاوید نامہ صفحہ ۱۶۸)

لیکن جمال و رعنائی کے اس نظارہ سے ابھی سیر نہیں ہوئے تھے کہ وہ حور

پاک زاد (یعنی - ہند) غلامی کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی آشفتہ مو، پریشاں حال، فریاد و شیون کرتی نظر آئی :-

گفت رومی روح ہند است این نگر
از فغانش سوزہا اندر جگر ـــــــ !

(صفہ ۱۶۸)

اور پھر اقبال کے کانوں میں روح ہندوستان کے نالہ و فریاد کی صدائے دل دوز آتی ہے :-

شمع جاں افسرد در فانوس ہند
ہندیان بیگانہ از ناموس ہند
مردک نامحرم از اسرار خویش
زخمہ خود کم زند بر تار خویش
کے شب ہندوستان آید بروز ؟
مرد جعفر زندہ روح او ہنوز!
تا ز قید یک بدن وامی رہد
آشیاں اندر تن دیگر نہد
گاہ او را با کلیسا ساز باز،
گاہ پیش دیریاں اندر نیاز

(صفہ ۱۷۰)

الاماں ۔۔۔ از جعفرانِ ایں زماں!

یہ وہ زمانہ ہے کہ دین و وطن کی آویزش و کشمکش اپنے شباب پر ہے ایک طرف برطانوی استعمار نے مسلم ممالک کو پارہ پارہ کر دیا ہے دوسری طرف ہندوستان میں کانگریس کے سامراج نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کر دی ہے انہیں نیشنلزم کے دام ہمرنگ زمیں میں گرفتار کر لیا ہے اور ان کی ایک معقول تعداد سواد اعظم سے کٹ کر عامۃ المسلمین کے جذبات و رجحانات سے قطع نظر کر کے مفاد ملی و دینی سے یکسر بے نیاز ہو کر کانگریس کے نیشنلزم پر ایمان لا چکی ہے اس گروہ میں ہر طرح کے لوگ ہیں اور یہ پورس کے ہاتھی بنے ہوئے ہیں، نام ان کے مسلمانوں کے سے ہیں لیکن یہ دین کو چھوڑ کر وطن کی پوجا کر رہے ہیں ملت سے انہیں کوئی واسطہ نہیں قوم ان کے لئے سب کچھ ہے یہ جگر فگار منظر دیکھ کر اقبال چیخ اٹھتے ہیں :-

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانہ میں کوئی حیدرِ کرار بھی ہے؟

لیکن ان کی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے انہیں اس نئے خیبر کو فتح کرنیوالا کوئی حیدر کرار نظر نہیں آتا ہاں وقت کے جعفر و صادق ضرور نظر آتے ہیں جن کے فتنہ و نفاق سے ملت اسلامیہ دو نیم ہو رہی ہے :-

ملتے را ہر کجا غارت گرے است
اصل او از صادقے یا جعفرے است
الاماں از روحِ جعفر الاماں

الاماں از جعفران ایں زماں،

(صفحہ ۱۷۱)

ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

جعفر و صادق کو ارواحِ رذیلہ سے اقبال یاد کرتے ہیں، کیونکہ "با ملک و ملّت غداری کرد"۔ اور اس غداری سے جہنم بھی ان سے اتنا متنفر ہو جاتا ہے کہ اپنی آگ اور اپنے شعلوں کی اسے توہین سمجھتا ہے کہ وہ ان ارواحِ رذیلہ کو اپنا ایندھن بنائے۔

منزلِ ارواحِ بے یوم النشور،
دوزخ از احراقِ شان آمد نفور
اندرون او دو طاغوتِ کہن
روحِ قومے کشتہ از بہر دو تن!
جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ!

آدمی غلام کیوں بن جاتا ہے؟ اپنی خودی اپنے وجود اپنی شخصیت کی خود ہی نفی کیوں کرنے لگتا ہے؟ کوئی آدمی ماں کے پیٹ سے غلام نہیں پیدا ہوتا، غلام بننا منظور کر لیتا ہے تو غلام بنا لیا جاتا ہے اگر وہ غلامی قبول کرنے سے انکار کر دے

تو کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ اپنی آزادی کے حفظ و بقا کے لئے اسے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے گا، یہی غلامی کا راز ہے، جو موت سے ڈرتا ہے وہ غلام ہے، اس کا مستحق ہے کہ غلام بنا لیا جائے جو موت کو کھیل سمجھتا ہے وہ شیر ہے اور موت ہرن، وہ خود موت کا شکار کر لیتا ہے موت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ بات کتنے دل آویز پیرایہ میں فرماتے ہیں :-

زندگی محکم زِ تسلیم و رضاست
موت نیرنج و طلسم و سیمیاست
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ
می فتد بر مرگِ آں مرد تمام
مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام[1]
ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ
زندگی اورا حرام از بیمِ مرگ
(صفحہ ۲۱۷)

ذرا بندۂ آزاد کی شان بھی دیکھ لیجئے :-

بندۂ آزاد را شانے دگر،
مرگِ او را می دہد جانے دگر
او خود اندیش است مرگ اندیش نیست
مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست (صفحہ ۲۱۷)

---

[1] کبوتر،

وہ بندۂ افلاک ہے، یہ خواجۂ افلاک!

مردِ حُر کا نام اقبال کی زبان پر آیا اور ان کی کیفیت بدلی،

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار!

بندۂ ناچار و مجبور کے لئے اقبال کے دل میں نہ رحم تھا نہ مروّت۔ ان کی نظر میں مردِ حُر، ہر توقیر و جلال کا مستحق ہے۔ لیکن بندۂ محکوم صرف اس لئے ہے، کہ حقیر و ذلیل نظروں سے دیکھا جائے۔ ان کے نزدیک مردِ آزاد، دلِ روشن اور نفسِ گرم کا مالک ہے اور محکوم کی پونجی دیدۂ نمناک کے سوا کچھ نہیں، آزاد پتھر کی طرح سخت ہے، جو ٹوٹ سکتا ہے لیکن جس میں لچک نہیں پیدا کی جا سکتی۔ اور محکوم انگور کی وہ نازک بیل ہے، جسے جہاں سے چاہو مروڑتے رہو، وہ مڑتی اور لچکتی جائے گی۔ آزاد خواجۂ افلاک ہے یعنی اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ اپنی ہی نہیں قوموں اور ملتوں کی بھی۔ محکوم بندۂ افلاک ہے، جو گردشِ سماوی کا ایک بے بس معمول ہے۔ ارمغانِ حجاز میں ایک مقام پر دل کی حقیقت بیان کرتے ہیں:۔

سمجھا لہو کی بوند اگر تو اسے تو خیر،

دلِ آدمی کا ہے فقط ایک جذبۂ بلند

(ارمغان حجاز صفحہ ۲۶۳)

دل کی حقیقت سمجھانے کے بعد ایک دوسرے مقام پر آزاد اور غلام کا فرق بتاتے ہیں:۔

آزاد کی رگ سخت ہے مانندِ رگِ سنگ

محکوم کی رگ نرم ہے مانندِ رگِ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طرب ناک
آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک
محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروّت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک
ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

(صہ ۲۲۶)

قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں!

نماز ـــــــ خواہ وہ جمعہ کی ہو یا عیدین کی، شکوہ و تجمل کی منظر اسی وقت ہو سکتی ہے جب آزاد بندوں کے سر خدا کے سامنے جھکیں۔ غلاموں کا سر تو ہر کہیں اور ہر جگہ جھک سکتا ہے، جھکایا جا سکتا ہے :۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں، ان کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی ان کی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال

یہ امتیں ہیں جہان میں برہنہ شمشیریں
خودی ہے مردِ خود آگاہ کا جلال و جمال
کہ یہ کتاب ہے، باقی تمام تفسیریں
شکوہِ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں

(صفحہ ۲۷)

فرد اور ملّت

ملّت۔ افراد کا مجموعہ ہے اس لئے فرد کے مقابلہ میں وہ زیادہ گراں بار فرائض کی حامل ہے اور اسی لئے قدرت کا قانون فرد کے مقابلہ میں اس کے لئے زیادہ سخت اور بے لچک ہے ایک فرد اگر غلامی پر قانع ہے تو، قابلِ معافی ہے۔ لیکن ایک قوم اگر اس پر رضامند ہے تو مستحقِ تعزیر ہے۔ غلامی کے اس دور میں مدّعیانِ علم و دانش تو بہت ہیں، لیکن ایسے بہت کم ہیں جو اہلِ نظر ہوں۔ جن کی نگاہ تیز، دل و جود تک پہنچ سکتی ہو۔

اہلِ دانش عام ہیں کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

(صفحہ ۲۷)

غلامی کا جوا اتارنے کے سلسلہ میں اگر افراد سست اور سہل انگار ہیں تو اس کی توجیہہ ہو سکتی ہے، تاویل کی جا سکتی ہے، لیکن پوری قوم سے یہ کبیرہ گناہ سرزد

ہو اور فطرت معاف کر دے ، یہ ناممکن ہے :-

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

زمانہ کی گردش چکی کی طرح انسان کو اور اس کے عزائم کو پیس ڈالتی ہے لیکن
جو اس گردش پر غالب آسکتا ہو وہ عمرِ جاوداں کا مالک ہے :-

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

(ص ۵۸)

مسلمان اور "گرفتارِ حاضر و موجود !" یہ اتنا بڑا جرم ہے جسے اقبال
کفر کے برابر سمجھتے ہیں :-

یہ کافری نہیں تو کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود
غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود!

(ص ۱۱۸)

فنونِ لطیفہ کے پرستاروں سے جن کا ذوقِ نظر بھی غلام ہے، اقبال
خطاب کرتے ہیں :-

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا ؟

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے،
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا؟
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیسان وہ صدف کیا وہ گہر کیا؟
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو،
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا؟
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

(صفحہ ۱۱۸)

غلامی افکار و اعمال کی قدامت اور کہنگی کا نام ہے آزادی فکر و نظر کی جدّت اور رعنائی سے عبارت ہے:۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منوّر ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسب ضیا ترے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے

(صفحہ ۱۲۰)

دست و بازو کی وہ قوت جو پہاڑوں کو متزلزل کر دے، بیکار اور لایعنی ہے اگر کردار و سیرت کی وہ توانائی نہ ہو جو ظالم اور جابر حکومتوں کا تختہ اُلٹ دے، پہاڑ کے ٹکڑے کر دینے سے خلقِ خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا لیکن دولتِ پرویز

کا خاتمہ خلق خدا کی خدمت ہے۔

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے
جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

(صفحہ ۱۲۷)

اے وائے تن آسانی!

مسلمانوں کے زوال و انحطاط کا ایک بہت بڑا سبب تن آسانی بھی ہے۔ آزادی اور حریت کی فضا میں سانس لینے والے سخت کوش اور جفاکش ہوتے ہیں، وہ موج دریا کی طرح منتظر جرس نہیں رہتے سرگرم سفر رہتے ہیں وہ آسانی اور سہولت کو نہیں دیکھتے سختی اور مصیبت کا خیر مقدم کرتے ہیں جب تک مسلمان میں یہ جذبہ پھر سے نہ پیدا ہو جائے وہ ابھر نہیں سکتا ترقی نہیں کر سکتا رفعت و عظمت کے منارے تک نہیں پہنچ سکتا اور یہ جذبہ اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتا جب تک فکر و نظر غلامی کی زنجیروں سے آزاد نہ ہوں اور اپنی راہ آپ پیدا کرنے کے خوگر نہ ہو جائیں۔

رقص کی دو قسمیں ہیں ایک بدن کا ایک روح کا :-

چھوڑ یورپ کے لئے رقص بدن کے خم و پیچ
روح کے رقص میں ہے ضرب کلیم اللّٰہی
صلہ اس رقص کا ہے تشنگیٔ کام و دہن
صلہ اس رقص کا درویشی و شاہنشاہی (صفحہ ۱۳۰)

اگر کل پر حق قائم کرنا چاہتے ہو تو آج پر استحقاق کا ثبوت دو :-

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

(صفحہ ۱۴۳)

اس دیر کہن سے نکلو اور افکار نو کی دنیا میں آجاؤ:-

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی
مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
وہی شراب وہی ہائے و ہو رہے باقی
طریق ساقی و رسم کدو بدل جائے

(صفحہ ۱۶۷)

کام کرنے والے دوسروں کی پیروی نہیں کرتے دوسروں سے اذن کے طالب نہیں ہوتے جو کچھ کرنا ہوتا ہے خود کر گزرتے ہیں:-

سفر آمادہ نہیں منتظر بانگ رحیل
ہے کہاں قافلۂ موج کو پروائے جرس؟

(صفحہ ۱۷۳)

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا وہ عشق یداللّٰہی
جو سختیٔ منزل کو سامانِ سفر سمجھے،
اے وائے تن آسانی! ناپید ہے وہ راہی

(صفحہ ۱۷۷)

"یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ!"

اقبال اپنی ملت اور اپنی قوم کو ایک ہی چیز کی تلقین جذب و اثر کی پوری قوت کے ساتھ کرتے ہیں، اور وہ یہ کہ انسان کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو وہ زمانہ کا، وقت اور مصلحت کا، اقوام غالب کا چاکر اور مطیع بن جائے، اور اس طرح اپنی ہر چیز ہار دے۔ یا خدا کا بندہ بن جائے اور ساری خدائی کو زیر نگیں کرے۔ یہ خود انسان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ان دونوں راستوں میں سے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے؟ زندگی کی شان، جمال و کمال، سکون و عافیت میں نہیں خطرات و مہالک کا مقابلہ کرنے میں ہے۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

تکرار اور تواتر کے ساتھ اقبال جس چیز پر زور دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ مغرب کی آب و تاب سے دھوکا نہ کھاؤ اس لیے کہ یہ حقیقت نہیں فریب ہے۔ یہ صناعی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ اسی پیام کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار
طائرکِ بلند بال دانہ و دام سے گذر،
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب
تیغِ بلال کی طرح عیشِ نیام سے گذر
تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر،

(بالِ جبریل ص۹۶)

غلامی کی زندگی، تیری خودی اور تیری شخصیت کی موت ہے خود شناسی، خود غرض کر۔
اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن! اپنا تو بن،

(ص۴۸)

لادین سیاست کی پیروی اور خدا ناشناسی کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ملوک و سلاطین کے سنگ آستان پر تیرا سر جھکتا ہے۔ لیکن اگر تو خدا شناس بن جائے تو یہ ملوک و سلاطین تیرے غلام بن جائیں گے۔

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم

(ص۵۱)

یا راہبی کر یا بادشاہی!

زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے ہیں:

(۱) ترکِ دنیا

(۲) تسخیرِ عالم

پہلی صورت اسلام کی تعلیم وتلقین کی ضد ہے، دُنیا اس لئے نہیں پیدا کی گئی ہے کہ اُسے ناپاک اور نجس قرار دے کر اُس سے دور بھاگا جائے۔ بلکہ وُہ اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کے معلوم ونامعلوم نعائم سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ترکِ دنیا کی تعلیم دوسرے ادیان ومذاہب کی بے شک ہے۔ لیکن اسلام تو واضح انداز میں تسخیرِ عالم کی دعوت دیتا ہے۔ جو قوم تسخیرِ عالم کے لئے پیدا ہوئی ہو وہ غلامی کی زندگی اختیار کرلے، غیر الٰہی نظام کو اپنا شعارِ حیات بنالے، اور لادینی تصورات میں غرق ہو جائے، کیا اس سے بڑا بھی کوئی المیہ ہوسکتا ہے؟

اقبال مسلمان ہیں وہ مسلمان کو مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کھلے بندوں صاف طور پر کہتے ہیں اگر تم مسلمان بن کر زندہ نہیں رہ سکتے تو مسلمان کی موت بھی تمہیں نہیں مل سکتی،

کہتا ہے تجھ سے کون مسلماں کی موت مر!

ان کی تعلیم وتلقین یہی ہے یا اسلام کا نام نہ لو اور رہبانیت کی زندگی بسر کرو اور اگر اسلام کے مدعی ہو تو پھر تم غلام نہیں رہ سکتے شہریاری تمہارا حق ہے اور یہ حق تمہیں ہر قیمت پر لینا چاہیئے۔

یہ جذبہ سرد ہو جائے تو آب و ہوا اور خاکِ وطن کچھ نہیں کر سکتی ملت اسلامیہ جب تک آزاد تھی اکابر رجال پیدا کرتی رہی۔ غلام بن گئی تو اس کی خاکِ وطن بانجھ ہو گئی:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

(بالِ جبریل صفحہ ۱۵)

مقامِ شبیری

اس کارگاہِ ہست و بود میں مسلمان کی زندگی طاغوتی طاقتوں سے مقابلہ و مزاحمت ہی میں صرف ہوتی ہے۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ انجام کیا ہوگا، کامیابی ہوگی یا ناکامی، جان سے ہاتھ دھو کر مرتبہ شہادت حاصل کرنا ہوگا یا جان دے کر بھی آخری پونجی —— فرزند و خویش —— تک کی بازی لگا دینا پڑے گی۔ اس چیز کو اقبال اپنی اصطلاح میں مقامِ شبیریؓ کہتے ہیں۔ اور مقامِ شبیریؓ وہ مقام ہے جسے ابدیت حاصل ہے جو لازوال اور لایزال ہے۔ یہ معرکہ حسینؓ کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا۔ آج بھی موجود ہے۔ اور قیامت تک موجود رہے گا۔ حق و باطل کی کشمکش ہمیشہ قائم رہے گی، فنا سے جو چیز محفوظ ہے، جاوداں اور ابدی جو چیز ہے، وہ مقامِ شبیریؓ یعنی ایثار و جہاد، قربانی اور فداکاری ہے:۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیریؓ
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی!

(صفحہ ۱۰۵)

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں
شکوہِ سنجر و فقرِ جنید و بسطامی

(صہ ۱۰۶)

جو بادشاہت جسم و جان پر ہوتی ہے وہ مٹ جاتی ہے، ختم ہو جاتی ہے۔
جس کا سکہ قلب و روح پر چلتا ہے وہ لازوال ہے:۔

نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی
کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو
رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو!

(صہ ۱۰۶، ۱۰۷)

اسلام کے فلسفہ اور ملت اسلامیہ کے جذبۂ کار پر اقبال کو اس درجہ اعتماد ہے کہ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ ان کا اعتماد۔ یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں:۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

(صہ ۱۳۶)

ہندی اور بین الاقوامی سیاست

اے خدائے مہر و مہ خاکِ پریشانے نگر
ذرّہ در خود فرو پیچد بیابانے نگر!

بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را
آتشِ خود را بہ آغوشِ نیستانے نگر!

شوید از دامانِ ہستی داغہائے سینہ را
سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانے نگر

خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر!

○

(۴)

ہندی اور بین الاقوامی سیاست

اقبال کی شاعری بامقصد شاعری تھی۔ وہ گل و بلبل، ہجر و وصال، شیریں و کوہکن، ہوس اور معاملہ بندی کی شاعری نہیں تھی۔ یہ شاعری زندگی سے اور زندگی کے حقائق سے تعلق رکھتی تھی۔

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

اور جس طرح زندگی گوناگوں، رنگا رنگ، متنوع اور مختلف احوال و مقامات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اقبال کی شاعری میں بھی یہ تمام رنگ نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ مسلم ہندی کی سیاست پر بحث کرتے ہیں۔ کبھی برہمن کی سیاست زیرِ غور لاتے ہیں۔ کبھی سیاستِ فرنگ ان کا موضوعِ طنز و تعریض ہوتی ہے۔ کبھی اقوامِ مغلوب و محکوم کی بے چارگی، اور بے بسی پر وہ شعلہ نظر آتے ہیں۔ کبھی صوفی و ملا کی تنگ نظری کے شاکی ہیں کبھی قوم کے تعلیم یافتہ طبقہ کی مغرب زدگی پر نوحہ کناں۔ کبھی عوام کی بے حسی اور غفلت پر وقفِ گریہ و ماتم دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی اپنی آرزوؤں، تمناؤں کو دل نشیں اور موثر پیرایہ میں بیان کرنے لگتے ہیں۔ کہیں وہ کلیم نظر آتے ہیں، کہیں حکیم۔ کبھی

ان کے الفاظ نشتر کا کام دیتے ہیں، کبھی مرہم کا، کبھی روتے ہیں اور رلاتے ہیں، کبھی ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں۔

لیکن یہ افکار اور ان کی بوقلمونی تابع ہے حالات و حوادث کی۔ وہ جو کچھ اور جیسا کچھ دیکھتے ہیں اس کے مطابق نواسنج ہو جاتے ہیں۔ بصارت کے ساتھ بصیرت بھی رکھتے ہیں، اس لئے دور تک دیکھتے ہیں۔ فراست بھی رکھتے ہیں اس لیے، جو دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتا انہیں واقعہ کی صورت میں نظر آجاتا ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

محمدِ عربیؐ سے ہے عالمِ عربی!

عرب قوم "عرب نیشنلزم" کے دام میں گرفتار ہو گئی۔ وہ اسے بھول گئی، کہ عربوں کی یہ سربلندی نتیجہ ہے محمد عربی کے ظہور کا۔ اور محمد عربی نے صاف اور واشگاف الفاظ میں مساواتِ انسانی کا اعلان فرما دیا تھا۔ انہوں نے اپنی امت کی بنا نہ وطن پر رکھی تھی نہ قوم پر، نہ قبیلہ پر، نہ خاندان پر، نہ حسب، نسب اور نسل پر۔ لیکن نیشنلزم کے پرستار عرب ان حقائق کو فراموش کر چکے ہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے یہ اقدام، یہ ذہنیت، یہ طرزِ فکر خود ان کے لیئے کتنا مہلک اور خطرناک ہے اُن کے وجود کے لئے کیسا سمّ قاتل ہے۔

متحدہ ہندوستان کے مسلمان، عالمِ اسلام کی سلامتی اور حفظ و بقا کے لیئے اپنی ہر چیز داؤں پر لگاتے رہے۔ لیکن عالم اسلام حدود و ثغور کے چکّر میں گرفتار رہا۔

مزید ستم ظریفی یہ کہ وہ عرب، جہاں سے اسلام اُبھرا تھا خود بھی اسلام سے منہ موڑ وطن کا پجاری بن گیا۔

کرے یہ کافرِ ہندی بھی جرأتِ گفتار
اگر نہ ہو امرائے عرب کی بے ادبی؟
یہ نکتہ پہلے سکھایا گیا کس امت کو!
وصالِ مصطفوی، افتراق بولہبی؟
نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمدِ عربی سے ہے عالمِ عربی

(صفحہ ۶۱)

اسلامی ممالک کے ایک بڑے طبقہ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ عروج وارتقا کا اصل راز تہذیبِ فرنگ کو اختیار کر لینا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہر بری چیز لے لی جائے اور ہر اچھی چیز چھوڑ دی جائے۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور؟

(صفحہ ۶۸)

ممالکِ عربیہ میں "عربستان" کی تحریک شروع ہوئی اور پھلی پھولی لیکن وہ تحریک — اسلام — فراموش کر دی گئی جس نے اس قوم کو امامِ اُمم بنا دیا تھا،

خودی کی موت سے لیبِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
(صفحہ ۷۹)

ایک نکتہ

یہ نکتہ بار بار ذہن نشین کرتے رہتے ہیں :۔

تیرے حرم کا ضمیر اسود و احمر سے پاک
ننگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود
(صفحہ ۱۱)

اشتراکیت

فرنگی استعمار کے مقابلہ میں اشتراکیت نمودار ہوئی جو برائیوں کے ساتھ ساتھ اپنے اندر کچھ بھلائی کے پہلو بھی رکھتی تھی :۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
(صفحہ ۱۳۸)

لین دین

شام گہوارۂ انبیاؑ و رسل ہے شام نے یورپ کو کیا دیا؟ اور یورپ نے شام کو کیا عطا کیا؟ اقبال کی زبان سے سنیئے:-

فرنگیوں کو عطا خاک سوریا نے کیا
نبیٔ عفت و غم خواری و کم آزاری
صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لئے
مے و قمار و ہجوم زنانِ بازاری

(صفحہ ۱۵۰)

لادین سیاست

یورپ کی سیاست لادین سیاست ہے کلیسا الگ ہے اور ایوانِ حکومت دوسری چیز، لیکن دونوں ضمیر سے محروم ہیں نتیجہ یہ ہے کہ جب حکومت کسی پر چھاپہ مارتی ہے کلیسا اس کا ساتھ دیتا ہے:-

جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی
خدا نے مجھ کو دیا ہے دلِ خبیر و بصیر
مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد

فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند!

مجلس اقوام کی زار و زبوں حالت پر اقبال نے تلخ اور تند الفاظ میں مسلسل نکتہ چینی کی ہے۔ مجلس اقوام کی تشکیل و تاسیس اس لئے ہوئی تھی کہ شہ زوروں سے کمزوروں کا حق دلائے۔ مظلوم کا ساتھ دے۔ ظالم کا مقابلہ کرے۔ لیکن اس نے مظلوم کو خدا کے حوالے کیا اور خود ظالم کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

باد صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی،
حرفے ز ما بہ مجلس اقوام باز گوئے
دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

(جاوید نامہ صفحہ ۱۸۹)

ایران انقلاب کے بعد

اقبال یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہوں، اپنی حقیقت سے واقف ہوں میدان عمل میں اتریں اور ایک مرتبہ دنیا کو پھر وہ نشان اور آن دکھا دیں جسے دیکھ کر وہ سجدۂ اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئی تھی لیکن اس کے برعکس جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی اسلامی ملک میں زندگی کی حرارت اور تڑپ پیدا ہوئی لیکن غلط رہنمائی کے باعث وہ غلط راستہ پر ڈال دی گئی تو انہیں بڑا صدمہ ہوتا ہے

ایران ایک عرصے سے روس اور برطانیہ کے سامراج کا شکار بنتا چلا آرہا تھا، اور وہاں کا شاہی خاندان یعنی قاچاری خاندان عیش و عشرت میں مست تھا، نہ اسے اپنی فکر تھی نہ اپنے ملک کی نہ اپنی قوم کی لندن اور پیرس کے نشاط خانوں میں کج کلاہانِ ایران دادِ عیش دیتے تھے اور اس سے بالکل بے پروا تھے کہ کل کیا پیش آنے والا ہے!

یہ حالات تھے جب ایران میں انقلاب رونما ہوا اور احمد شاہ قاچار کو پیرس میں مصروفِ نشاط چھوڑ کر ایران کے ایک سپاہی رضا شاہ پہلوی نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اب شاہ قاچار کے بجائے شاہ پہلوی کا دور شروع ہو گیا رضا شاہ کی انقلابی ذہنیت سے اقبال کو بڑی توقعات تھیں وہ سمجھتے تھے شامِ غم ختم ہوئی اور صبحِ امید طلوع ہو گئی لیکن رضا شاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی جن "اصلاحات" کا آغاز کیا انھوں نے امید کو یاس سے بدل دیا اسلام کے بجائے قدیم ایرانی تہذیب و تمدن کے احیا اور اس کے ساتھ قومی تعصب کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ اس کیفیت کو اقبال کا قلم لہو رو رو کے یوں بیان کرتا ہے:-

بعد مدت چشمِ خود بر خود کشاد،
لیکن اندر حلقۂ دامے فتاد،
کشتۂ نازِ بتان شوخ و شنگ
خالقِ تہذیب و تقلیدِ فرنگ
کارِ آں وارفتۂ ملک و نسب
ذکرِ شاپور است و تحقیرِ عرب،
روزگارِ او تہی از واردات

از قبور کہنہ می جوید حیات

کس حسرت، اور درد سے فرماتے ہیں:-

با وطن پیوست و از خود درگذشت
دل بہ رستم داد و از حیدر گذشت
نقش باطل می پذیرد از فرنگ،
سرگذشت خود بگیرد از فرنگ،
پیری ایران زمان یزدجرد
چہرہ او بے فروغ از خون سرد،
دین و آئین و نظام او کہن،
شید و تار صبح و شام او کہن
موج مے در شیشہ تاکش نبود
یک شرر در تودۂ خاکش نبود

(جاوید نامہ ۲۰۳، ۲۰۴)

افغانستان

ایران کے بعد افغانستان کا نمبر آتا ہے، اس ملک نے اپنی آزادی کو قائم اور برقرار رکھنے کے لئے بہت کچھ کیا لیکن سحرِ فرنگ نے اسے بھی مسحور کر لیا۔ زندہ رود کی زبان سے اقبال گویا ہوتے ہیں:-

امتاں اندر اخوت گرم خیز،

او برادر با برادر در ستیز،
از حیاتِ او حیاتِ خاور است
طفلک ده سالہ اش لشکر گر است
بے خبر خود را ز خود پرداختہ
ممکنات خویش را نشناختہ
مرد رہرو را بہ منزل راہ نیست،
از مقاصد جانِ او آگاہ است

(صفحہ ۲۰۷)

پھر ابدالی کی زبان سے ملتِ افاغنہ کے بارے میں اقبال یہ تاثرات پیش کرتے ہیں:۔

آسیا یک پیکرِ آب و گِل است
ملتِ افغاں در آں پیکر دل است
از فسادِ او فساد آسیا،
در کشادِ او، کشاد آسیا،
ہمچو تن پابند آئینی است دل
مردہ از کین زندہ از دین است دل (صفحہ ۲۰۸)

اس کے بعد فرماتے ہیں مغرب کے عروج و ارتقا کا راز کیا؟ یہی تو سمجھو صرف نقالی اور ظواہر کی پرستش تو بے کار ہے:۔

شرق را از خود برد تقلید غرب
باید این اقوام را تنقیدِ غرب

قوتِ مغرب کا راز چنگ و رباب اور رقصِ بے حجاب میں پوشیدہ نہیں ہے بلکہ اس کا سِرّ مکتوم علم و ہنر ہے، تقلید کرنا ہے تو اس کی کر :-

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دختراں بے حجاب
نے ز سحرِ ساحران لالہ روست
نے ز عریاں ساق، و نے از قطع موست
محکمی او را نہ از لادینی است
نے فروغش از خط لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوان شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کُلہ یا آن کُلہ مطلوب نیست
فکر چالاکے اگر داری بس است
طبع درّاکے اگر داری بس است

نکتہ کی بات یہ ہے :-

گر کسے شبہا خورد دودِ چراغ
گیرد از علم و فن و حکمت سراغ

(صفحہ ۲۰۹)

پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق؟

مشرق پر مغرب کا تسلط اقبال کے لئے ناقابلِ برداشت ہے وہ صرف مسلمان ہی کو نہیں جملہ اقوامِ مشرق کو عام اس سے کہ ان کا دین و مذہب کچھ بھی ہو یہ تلقین کرتے رہتے ہیں کہ غلامی کی بیڑیاں کاٹ کر آزادی کے راستہ پر گامزن ہوں وہ جانتے ہیں، صیاد، مُرغِ قفس کو رہائی نہیں بخشتا لیکن مرغ قفس میں اگر حوصلہ ہو تو وہ اپنے نازک پروں سے قفس کی آہنی تیلیاں توڑ سکتا ہے:-

قفس کی تیلیاں توڑ بس تڑپ کر
نہیں آتا اُنہیں آزاد کرنا،

جو کام مرغِ قفس کر سکتا ہے وہ انسان کیوں نہیں کر سکتا؟

فرنگی چیرہ دستی اور سفاکی ظلم و ستم، اور جوع الارض کی داستان سن کر وہ اقوام مشرق کو آزادی کی منزلِ مقصود کی طرف رہبری کی تاکید کرتے ہیں بغیر اس کے مشرق کی نجات ممکن نہیں:-

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ برچید از فرنگ

(صفحہ ۵۶)

جس فرنگی نظام نے آدمیت کو آشفتہ حال اور پریشاں روز کر رکھا ہے، اس سے نکلنے کی بہر حال کوشش کرنی چاہیئے جبکہ مشرق و مغرب کے فکر و نظر میں بھی زمین آسمان کا فرق ہے:-

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد،
زیرِ گردوں رسم لادینی نہاد،
مشکلاتِ حضرت انساں از واست
آدمیت را غمِ پنہاں از واست
در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروانِ زندگی بے منزل است
(صفحہ ۵۶)

کشمیر

(۵)

کشمیر

تنم گلے ز خیابان خطۂ کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است

کشمیر سے اقبال کو صرف وطنی نسبت ہی نہیں تھی ملّی نسبت بھی تھی، مسلمان کے پاؤں میں اگر کانٹا بھی چبھتا تھا تو اقبال اس کی چبھن اپنے دل میں محسوس کرتے تھے، کسی اسلامی ملک پر آفت آتی اقبال خون کے آنسو رونے لگتے تھے ملتِ اسلامیہ کا کوئی حصہ کسی خطۂ ارض میں مبتلائے آفت و حوادث ہو اقبال برابر کے شریک غم بن جاتے تھے پھر کشمیر تو چند قدم کے فاصلے پر تھا یہاں مسلمانوں کی غیر معمولی اکثریت تھی اور اس اکثریت کے پاس کیا نہیں تھا؟ حسن و جمال، رعنائی و زیبائی، جودت و ذہانت فکر و نظر، اہلیت و قابلیت، جذبۂ ایثار و خدمت، پھر بھی یہ ایک حقیر اقلیت کی غلام بنی ہوئی تھی۔ دنیا آزاد ہو رہی تھی ذرا ذرا سے ملک عروسِ آزادی سے ہمکنار ہو رہے تھے لیکن کشمیر غلام تھا اس کی غلامی کی بیڑیاں اور زیادہ مضبوط ہوتی جا رہی تھیں، اس کا شکنجہ اور زیادہ سفاکی اور وحشت، درندگی اور بربریت کے ساتھ کسا جا رہا تھا اس پر بے تحاشا اور بے محابہ ظلم توڑے جا رہے تھے آزادی کا نام لینا جرم تھا

تاریخی مسجدیں مقفل تھیں یا پھر وہاں سرکاری دفاتر مصروفِ کار تھے کئی مقدس خانقاہیں پنجۂ اغیار میں تھیں اور ہندو وہاں دادِ عیش دے رہے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں کشمیری مسلمان خال خال نظر آ رہے تھے اس کے باوجود حوصلہ افزائی کے بجائے ان کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی سرکاری دفاتر میں ان کی پوچھ نہیں تھی ایوانِ وزارت میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے تھے اگر کوئی مسلمان وزیر بنایا بھی جاتا تھا تو اس کے لئے شرط تھی کہ وہ کشمیری نہ ہو دور دراز مقامات سے مسلمان وزیر چنا جاتا تھا۔

اقبال یہ دیکھتے تھے اور ان کا دل کڑھتا تھا وہ خون کے آنسو روتے تھے اور چاہتے تھے دنیا بھی ان کے ساتھ روئے یا پھر ان کی ہم نوا ہو کر آزادیٔ کشمیر کے سوال پر تائید و تعاون کا ثبوت دے۔

کشمیر کا حسن اس لئے تھا کہ غیر ممالک کے سیاح آئیں اور اس سے لطف اندوز ہوں کشمیریوں کا جمالِ رعنا اس لئے تھا کہ سستے داموں کوڑیوں کے مول بکے کشمیر کی ہنرمندی ان کی دستکاری ان کی ژرف نگاہی اس لئے تھی کہ وہ دن رات ایک کر کے چیزیں تیار کریں جو کوڑیوں کے دام مول لی جائیں اور سونے کے بھاؤ فروخت کی جائیں، کشمیری مسلمان کی قابلیت اور اہلیت، استعداد اور استحقاق کا مصرف یہ تھا کہ اسے پائے حقارت سے ٹھکرایا جائے۔

یہ سب کچھ دیکھ کر اقبال کیونکر خاموش رہ سکتے تھے؟ انہوں نے جب اور جہاں موقع ملا اس مسئلہ پر لب کشائی کی اور نعرۂ حق بلند کیا نثر میں بھی اور نظم میں بھی اور ایوانِ حکومت میں بھی، اقبال نے آزادیٔ کشمیر کے لئے وہاں کے مسلمانوں کو بھی ابھارنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی اور اندرون ہند کے مسلمانوں، اور

انصاف دوستوں کو بھی اس مسئلہ پر دل و جان سے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

کشمیر کے سلسلہ میں اقبال نے خطوط، تقاریر، اور بیانات کی صورت میں جو کچھ کہا اس کا مختصر سا جائزہ ہم لے چکے ہیں اب زیادہ سے زیادہ اختصار کے ساتھ کلام اقبال سے کشمیر کی داستان سنیں گے۔

نشاط باغ میں بیٹھ کر

پیام مشرق میں ہمیں ایک ساقی نامہ نظر آتا ہے یہ ساقی نامہ اقبال نے کشمیر میں اور کشمیر میں بھی نشاط باغ کے اندر بیٹھ کر سپرد قلم کیا ہے خیالات ہیں کہ اُمڈے چلے آ رہے ہیں جذبات ہیں کہ روکے نہیں رکتے الفاظ، خوشنما، سبک، دل آویز، پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں؛ اقبال پر کیف اور بے خودی کا عالم طاری ہے۔ کشمیر سے باہر بھی کشمیر کو وہ یاد رکھتے تھے لیکن کشمیر پہنچ کر، نشاط باغ میں بیٹھ کر کشمیر کی زار و زبوں حالت ان کے سمندِ فکر پر تازیانہ کا کام کرتی ہے وہ کہہ اٹھتے ہیں:۔

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے
نجوم پرن رُست از مرغزارے
زمیں از بہاراں چو بال تدروے
ز فوارہ الماس بار آبشارے
نہ پیچید نگہ جز کہ در لالہ و گل —!
نہ غلطد ہوا جز کہ بر سبزہ زارے
لب جو خود آرائی غنچہ دیدی؟

چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
چہ شیریں نوائے چہ دلکش صدائے
کہ می آید از خلوتِ شاخسارے
بہ تن جاں، بہ جاں آرزو زندہ گردد
ز آوائے سارے ز بانگ ہزارے

(پیامِ مشرق صفحہ ۱۳۲)

اور آخر بے ساختہ یہاں کا دل افروز اور روح پرور منظر دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں:-

تو گوئی[1] کہ یزداں بہشتِ بریں را،
نہاد است در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را،
رہا سازد از محنتِ انتظارے

یکایک انہیں یاد آجاتا ہے کہ یہ جنت تو جہنم ہے یہ خطۂ گل نہیں خطۂ آتش ہے یہاں آزاد نہیں غلام بستے ہیں۔ یہ خوبصورت ملک غلامی کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے یہ مناظر یہ آب و ہوا یہ حسن رہ گذر یہ جمال و رعنائی ہر چیز غلام ہے۔ خودی سے محروم خودنگری سے ناآشنا یہاں کی آب و ہوا غلام یہاں کے مرد و عورت غلام یہاں کا علم و ہنر غلام۔ یہ احساس انہیں سینہ کوبی پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ کہتے ہیں:-

کشیری[2] کہ با بندگی خو گرفتہ،
بتے می تراشد ز سنگِ مزارے

[2] کشمیری

ضمیرش تہی از خیال بلند ہے
خودی ناشناسے زخود شرمسارے
بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینۂ او دل بیقرارے
ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری[1]
کہ خاکسترش آفریند شرارے

کشمیر کی یاد

کشمیر کا لفظ جب بھی اقبال کی زبان پر آجاتا ہے وہ بے خود ہو جاتے ہیں، کشمیر کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں کہ جنت کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا۔ پیامِ مشرق میں ایک مقام پر کشمیر کا ذکر کرتے ہیں، چند اشعار سنئے :-

رخت با کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر
بادِ بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر
لالہ ز خاک بر دمید موج بآبجو تپید
خاک شرر شرر ببیں آب شکن شکن نگر

[1] کشمیری

زخمہ بہ تارِ ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز
قافلہ بہار را انجمن انجمن نگر!

دخترکے برہمنے لالہ رخے سمن برے
چشم بروئے او کشا باز بخویشتن نگر

ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟

کشمیر کی غلامی، کشمیریوں کی مظلومی اور تباہ حالی حکمران طبقہ کی دراز دستی اور سفاکی کوہستانِ کشمیر میں مسلم اکثریت کی پامالی اور ہندو اقلیت کی فرماں روائی یہ وہ حوادث تھے جنہوں نے اقبال کا دل خون کر دیا تھا کشمیر میں آزادی اور حریت کی ذرا سی بھی لہر اٹھتی دیکھتے تھے تو فرطِ مسرت سے ان کے بند قبا ٹوٹنے لگتے تھے ملا زادہ کی زبان سے کہتے ہیں :۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
سینۂ افلاک سے اٹھتی ہے آہِ سوز ناک
مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر
کہہ رہا ہے داستاں بیدردیٔ ایام کی!
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیر گیر؟ (ارمغانِ حجاز ص ۲۵۸)

قادیانیت

سخت باریک ہیں اَمراضِ اُمم کے اَسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی!
دینِ شیری میں غلاموں کے امام اَور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی!
ہو اگر قوّتِ فرعون کی در پردہ مُرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

قادیانیّت

قادیانی تحریک سے اقبال سخت و شدید اختلاف رکھتے تھے۔ یہ اختلاف علمی بھی تھا اور سیاسی بھی، علمی اس اعتبار سے کہ از روئے قرآن و سنت وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ اب تا قیامِ قیامت کوئی نبی مبعوث ہو سکتا ہے۔ وحدتِ ملّی کے لیے ختمِ نبوت کا عقیدہ بنیاد و اساس کی حیثیت رکھتا تھا اور جو تحریک اس عقیدہ پر ضرب لگانے کی کوشش کرتی ہو اُسے اقبال معاف نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی اعتبار سے اس تحریک کے وہ یوں مخالف تھے کہ محکوم کے الہام کو بھی وہ محکوم سمجھتے تھے ایسے الہام سے فتنوں کے دروازے تو کھل سکتے ہیں لیکن نجاح و فلاح کی کوئی صورت نہیں پیدا ہو سکتی۔ شروع شروع میں اس تحریک کے مقاصد کو انہوں نے اتنی سختی سے محسوس نہیں کیا تھا جتنا آخرِ عمر میں، چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے بیانات بھی دیئے، خطوط میں بھی اپنے اضطراب کا اظہار کیا اور اشعار میں بھی اپنے تاثرات و واردات بے کم و کاست پیش کر دیئے۔

اس موضوع پر اگر اقبال کے فارسی اور اردو اشعار تلاش کیے جائیں تو

اچھا خاصا ذخیرہ فراہم ہو سکتا ہے لیکن ہم اس سلسلہ میں چند اشعار پر اکتفا کریں گے ان سے اقبال کے نقطۂ نظر اور خیالات و تاثرات کا پورے طور پر اندازہ ہو جائے گا اور یہی ہمارا مقصد ہے۔ اس عنوان کے تحت ہم نے جو اشعار درج کئے ہیں ان کے ساتھ کوئی توضیحی عبارت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ خود اپنی تفسیر و تشریح آپ ہیں :-

(۱)

مہدیٔ برحق

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار
ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

(ضربِ کلیم ص۴۹)

(۲)

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے
فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

(صفحہ ۴۶)

(۳)

الہام اور آزادی

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز

اس کے نفسِ گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاکِ چمنستان شرر آمیز
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز
اس مردِ خود آگاہ و خدا مست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(۴)

نبوّت

میں نہ عارف نہ مجدّد نہ محدث نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام
عصرِ حاضر کی شبِ تار میں دیکھی میں نے
یہ حقیقت کہ ہے روشن صفتِ ماہِ تمام
وہ نبوّت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش[1]
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

[1] بھنگ

(۵)

نفسیاتِ غلامی

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مُرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

(صہ ۱۶۱)

(۶)

جہاد

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زِرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات؟
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگذر؟

(صہ ۲۳)

قیمت :- پانچ روپیہ پچاس پیسے

فیروز سنز، کراچی